

# حاشية على كتاب

رحمة الله عليه



مجلد شفيع صابر

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi  
Preserved in Punjab University Library.**

**پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ  
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ**





مَنْ دَعَلَ صَالِحًا مِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِذَا مُتَ وَمَنْ دَعَلَ مَعْصِيَةً مِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِذَا حَيَّاهُ طَيْبَةً  
جس نے اپنے عمل کے خواہ مرے ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔

خلافِ پیغمبر کے راہ گزید  
کہ ہرگز بمنزلِ خواہد رسید



# حیاتِ پیرایا

شہنشاہِ خراسان غوثِ زمان  
سید علی غواصِ ترمذی <sup>رحم</sup>  
کے حالاتِ زندگی

مؤلف

محمد شفیع صاحب

جملہ حقوق محفوظ

128358

نام کتاب : حیاتِ پیر بابا  
تاریخی نام : بکر شریعت و معرفت  
۱۹۸۶ء

تالیف و ترتیب : محمد شفیع صاحب  
محبوب الرحمن خوشنویس

کتابت : ایک ہزار  
بار اول : ۳۰-۰۰ روپے  
قیمت :  
مطبع : فیاض منتغیر پرنٹرز۔ ۱۷ دربار مارکیٹ لاہور  
اہتمام : سید محمود شاہ ترمذی

ملنے کے پتے : ۱۔ یونیورسٹی بک ایجنسی۔ خیبر بازار۔ پشاور  
(ٹیلیفون: 62534)

۲۔ فارورڈ ہائی سکول۔ آسامائی۔ پشاور  
(ٹیلیفون: 61273)

۳۔ سید محمود شاہ۔ 28-A۔ سول کوارٹرز پشاور  
(ٹیلیفون: 65343)

# مندرجات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	تعارف از علامہ اجل قاضی عبدالدائم وائم	۹
۲	مقدمہ از مولف	۱۹
۳	عظیم خانوادہ	۵۷
۴	حیات مبارکہ	۷۶
۵	افکار و نظریات	۹۰
۶	مجاہدانہ کارنامے	۱۰۳
۷	جھوٹے مدعیان کا بطلان	۱۱۳
۸	پیر روشن یا پیر تاریک	۱۲۳
۹	اخون درویزہ بابا	۱۵۶
۱۰	خلفاء اور اولاد	۱۶۳
۱۱	سلاسل طریقت	۱۸۵
۱۲	شجرہ نسب کا جائزہ	۱۹۰



# ہکیر عقیدت

بمضور غوثِ زمان، علامتِ حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف پیر باباؒ

ہر ایت کے زندہ نشان پیر باباؒ  
 محبتِ مجاہد عقیدت کے ماویٰ  
 خزاں کا جہاں تک گذر ہی نہیں ہے  
 ہر اک دل ہے انکی محبت سے روشن  
 کھچے آرہے ہیں سلامی کو سب لوگ  
 شہنشاہ بھی جھک رہے ہیں جہاں پر

طریقیت کے اک رازواں پیر باباؒ  
 رفیع نشان، خلد آشاں پیر باباؒ  
 وہ اک گلشن بے فراں پیر باباؒ  
 ہیں وہ مشعلِ ضلالتاں پیر باباؒ  
 ہے دربارِ غوثِ زمان پیر باباؒ  
 وہی ہے ترا آستاں پیر باباؒ

تو ہی نظر کا ہے فیضان سارا  
 کہ صابر بھی ہے مدح خواں پیر باباؒ



# منقبت

بمختصر غوث زمان سید علی غواص المعروف پیر بابا علیہ الرحمۃ

از۔ سردار سعد اللہ خان سعد صاحب

ڈیرہ غازی خان

راز دارِ رمزِ قرآنِ مبین  
لا الہَ اِلاَّ ہُوَ حقِّ گفتنِ بے  
بر مزارش چرخِ فی مالِ حبیب  
تا وہد با ملتش سوزِ یقین  
پیر بابا، استخارِ مسلمین  
حرفِ او شیریں چونِ مثلِ انگبین

پیر بابا، فخرِ ملت، فخرِ دین  
پاش از ضربش بتان آوری  
من چه گویم رخصتِ آن خاکِ پاک  
لالہ ہا روید ز خاکِ پاک او  
کردنِ تیر جہاں از خونِ خویش  
ضربِ او کاری چونِ مروغہ کار

می کنم صد بار شکر کردگار

سعد گر ہمین رخِ آن نازنین





## ہدیہ عقیدت

بعض قدوة السالکین، امام المتقین حضرت پیر بابا برنیری علیہ الرحمۃ

سید محمد معصوم شاہ ترمذی (ایم اے ایل ایل بی)

یہی ہے مری التجا پیر بابا  
 ذرا رخ سے پروہ ہٹا پیر بابا  
 مجھے جام ایسا پلا پیر بابا  
 کہ ہو جائے نالہ رسا پیر بابا  
 فقروں کی ہے یہ صدا پیر بابا  
 محبت میں کر دے فنا پیر بابا  
 کہ ہو تم شہ اولیا پیر بابا  
 اسے جب سے بیٹھے بھلا پیر بابا  
 ہیں اپنے پرانے خفا پیر بابا  
 خدا را ہے وقت و عا پیر بابا  
 مسلمان کو کیا ہو گیا پیر بابا  
 عجب شے ہے موج بلا پیر بابا  
 عطا کر، عطا کر، عطا پیر بابا

مجھے اپنا جلوہ دکھا پیر بابا  
 بڑی دیر سے منتظر ہیں نگاہیں  
 من و تو کا جھگڑا ہے پھر نہ باقی  
 کوئی ایسا انداز مجھ کو عطا کر  
 سوالی تیرے در سے جائے نہ عالی  
 تمنا ہے اتنی غلاموں کو اپنے  
 زمانے کو تسلیم ہے یہ حقیقت  
 دیا تھا شجاعت کا جو درس تم نے  
 زمانے میں اب کوئی عزت نہیں ہے  
 زمانہ مٹانے پر اب تل گیا ہے  
 وہ غیرت، شجاعت، حمیت کہاں ہے  
 بھنور سے نکلنے کی صورت نہیں ہے  
 عطا کار ہے تو خدا جانتا ہے

فقروں سے رکھنا ہے الفت ہمیشہ  
 ہے معصوم کی یہ خطا پیر بابا

## حضرت پیر بابا بونیریؒ

رحمت کا اک جہاں ہے سرکار پیر باباؒ  
 بے مثل وبے غرض تھا ایشا پیر باباؒ  
 ہر سمت دوڑتا تھا رہوار پیر باباؒ  
 کس درجہ دل نشیں ہیں اقدار پیر باباؒ  
 چھائے ہوئے ہیں ہر سو انوار پیر باباؒ  
 راہبر ہیں، رہ نما ہیں اطوار پیر باباؒ  
 عظمت کا اک نشاں ہیں انکار پیر باباؒ  
 چلتی ہے حق کی خاطر تلوار پیر باباؒ  
 ہو جاتے مجھ کو اک شب دیدار پیر باباؒ

پر لطف و پرکشش ہے دربار پیر باباؒ  
 اعزاز کیوں نہ ملتا دربار کبریا سے  
 ایسا نہ ہو کہیں سے الحاد سر اٹھانے  
 وہ فخر صوفیا رہیں سردار اولیا رہیں  
 یاں وجد میں ہے کوئی، کوئی مراقبہ میں  
 ان کے نقوش پارہیں درس حیات کامل  
 سب طالبان حق کو یاں سے ملی ہدایت  
 پیغام مرگ ہے یہ کفار و فاسقوں کو  
 کرے قبول مولا، میری اس اک دعا کو

اے فکر! بڑھ کے ان کو میں چوم چوم لوں گا

آئیں نظر جو مجھ کو آثار پیر بابا رح

ڈیرہ غازی خان



نیچر فکر :-

# اظہار شکر

اس مسکین بے تمکین کو بہت عرصہ سے جدا مجد اعلیٰ حضرت پر بابا، (بونیری) حالات اور ان کی اولاد کے سحرے فراہم کرنے کا شوق دامنیگر تھا مگر کم مائیگی، بے بضاعتی اور عدم الفرستی کی وجہ سے ہمت نہیں پڑتی تھی چنانچہ یہ تذکرہ میں نے جناب محمد شفیع صاحب (پشاور) سے کیا تو انہوں نے باوجود مصروفیات کثیرہ و کمزوری صحت کے بلا تامل بغیر کسی دنیاوی طمع و لالچ کے یہ بیڑہ اٹھایا اور بہت کھوٹے عرصہ میں ایک عمدہ جامع اور جاذب قلب مسودہ تیار کر دیا۔ ان کا یہ کارنامہ محض اسلامی جذبہ اور اہل اللہ سے گہری عقیدت و محبت کا ثمرہ ہے اس پر ان کا جتنا شکر یہ ادا کیا جاتے اور ان کی جتنی داد دی جائے، کم ہوگی۔ یہ مسکین بھی دعا گو ہے اور قارئین کرام سے بھی التماس ہے کہ ان کی درازی عمر صحت کاملہ اور ترقی درجات فی الدارين کے لئے دعا کریں۔

یہ مسکین ان کے علاوہ ان کے بر خوروار طفلاً السلام کا بھی شکر گزار ہے کہ انہوں نے کتابت کے معاملے میں پوری تگ و دو سے کام کیا۔ سب سے زیادہ قابل مسرت و باعث شکر امر یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت علامہ اجل قاضی عبداللہ مظلہ العالی سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ ہنری پور (ہزارہ) نے اس مسودہ کو محض پسند ہی نہیں فرمایا بلکہ اس پر ایک دلکش و فاضلانہ تعارف لکھ کر اس کتاب کی زینت میں اضافہ فرمایا۔

جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الخیارات

وَصَلَّى اللهُ تَعَالَى وَبَارَكَ وَسَلَّمَ عَلَى حَبِيبِهِ وَعَلَىٰ آلِهِ قَدِيرٍ حَسْبُهُ وَجَمَالِهِ

مسکین سید محمود شاہ ترمذی

ریٹائرڈ ڈیپنٹیشن آفسر عمکہ تعمیرات و مواصلات پشاور

# تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ . وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی جَبِيْبِهِ الْكَرِيْمِ

پیر باباؒ وہ پیارا نام ہے جو صوبہ صحرے کے نیچے نیچے کی زبان پر ہے، ہر دل ان کی یاد سے سرشار ہے اور ہر سران کا نام سنتے ہی فرط عقیدت سے جھک جاتا ہے، صدیاں گزر جانے پر بھی ان کی عقیدت و احترام میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کوئی موسم ہو، کوئی زمانہ ہو، ٹرکوں، بسوں، دیکھتوں اور کاروں پر جھنڈے لہراتے ہوتے زائرین بونیر میں ان کے مرقد مبارک کی جانب دداں دواں نظر آتے ہیں۔ وزیرستان سے چترال تک اور آزاد کشمیر اور ہزارہ سے خیبر اور جلال آباد تک شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس کا دل پیر باباؒ کی یاد سے آباد نہ ہو۔ — اس بزرگ ہستی سے لوگوں کی محبت اور عقیدت بالکل بجا ہے، اس لئے کہ ہمیں دولتِ دین ملی تو اپنی اولیائے کرام اور مبلغین عظام کی بدولت ملی اور ایمان کی دولت سے بڑھ کر قابلِ قدر نعمت اور کیا ہوگی اور کیا ہو سکتی ہے؟ — یہ حضرات بلاشبہ ہمارے محسن اور مرئی ہیں۔ لیکن اسے تغافل و تساہل کہا جائے یا کوئی اور نام دیا جائے کہ آج تک پیر بابا علیہ الرحمۃ جیسی جامع کمالاتِ ہستی کے بامعے میں کوئی مفصل اور سیر حاصل تصنیف منظر عام پر آئے پائی — اور عقیدت و احترام کے باوجود لوگ ان کی جامع کمال شخصیت، ان کے کاموں اور کوششوں سے کما حقہ آگاہ ہونے نہ پاتے۔

بدقسمتی سے مغربی انکار اور لادینی نظریات کی یلغار سے آج کے نوجوان کا ذہن کچھ اس طرح متاثر ہوا ہے کہ وہ تصوف و طریقت سے "الربک" دکھائی دیتا ہے

با دیان طریقت کا نام سنتے ہی ان کے ذہن میں کسی تارک الدنیا، چلہ کش اور ازکار رفتہ انسان کا ہیوولی اُبھر تک ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگمان کرام سے بڑھ کر فعال اور بیدار شاید ہی کوئی اور ہوا ہو۔ یہ وہ مجاہدین فی سبیل اللہ تھے جنہیں نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ انہیں لگن تھی تو بس یہی کہ اللہ کے دین کو بھرو اور کوہِ دامن کے گوشے گوشے تک پہنچادیں۔ ان کے کارنامے حیرت انگیز اور ان کا جہاد تعجب خیز تھا۔ اور ان سے بڑھ کر مردانِ کار اور مجاہدین شاید ہی کوئی اور ہوتے ہوں۔

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کی تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے پیشتر ذرا اس وقت کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر پر نگاہ دوڑائیے، گنڈھارا یا قدیم صوبہ سرحد آریائی اور ہندو تہذیب کا عظیم گڑھ تھا۔ بالخصوص سرزمینِ یوسف زئی (جو زیادہ تر حضرت پیر باباؒ کی سرگرمیوں کی جولان گاہ رہی) کفر، شرک اور بوہمت کا مرکز تھا۔ شہباز گڑھ تحت بانی، ہند، سوات اور دیر کے آثار قدیمہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں اللہ واحد کا ایک بھی نام لیوا نہ تھا۔ ان کافر حکمرانوں نے نہ صرف پہاڑوں کے ہر کلیدی مقام پر قلعے بنا رکھے تھے بلکہ پہاڑی غاروں میں بھی دفاعی مرکز قائم کر رکھے تھے۔ شہنشاہوں کی فوجیں بھی انہیں مستحضر کرنے سے عاجز آچکی تھیں لیکن کفر اور شرک کی ان طاقتوں کو زیر کیا تو حضرت پیر باباؒ اور دوسرے اولیائے کبار اور مبلغین والا تبار ہی نے کیا۔ ان بزرگانِ کرام نے نہ صرف کافروں اور مشرکوں کی دنیوی وجاہت کے بٹ پاش پاش کر کے رکھ دیئے بلکہ انہیں اسلام کی روشنی تعلیمات سے روشناس کیا اور اس شان سے تبلیغی فرائض انجام دیتے کہ آج ان سارے علاقوں میں ڈھونڈنے سے بھی کسی کافر اور مشرک کا نشان تک نہیں ملتا۔ کسی نے خوب کہا ہے شہنشاہ اور سلاطین لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتے ہیں لیکن اللہ والے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ کفر دار ہند اور بالخصوص کوہستان سوات و بونیر میں ایک

عظیم اور مبارک اسلامی انقلاب رونما ہوا تو حضرت سید علی خواص ترمذی المعروف پیر بابا علیہ الرحمۃ ہی کی کوششوں اور مجاہدانہ مساعی سے ہوا۔

حضرت پیر بابا کی مفصل سوانح حیات مرتب کرنے کا خیال سب سے پہلے انہی کے خالوادہ کے چشم و چراغ الحاج سید محمود شاہ ترمذی مدظلہ العالی کے ذہن میں آیا۔ شاہ صاحب کی ترغیب پر اس کام کا بیڑا جناب محمد شفیع صابر صاحب نے اٹھایا۔ صابر صاحب جہاں انگریزی کے ایم۔ اے ہیں وہیں فارسی، عربی، پشتو اور ہندکو ادبیات کے فاضل بھی ہیں۔ قدیم و جدید علوم کی آگاہی نے انہیں ایک متوازن نقطہ نگاہ بخشا ہے، وہ دراز کار مباحث اور اختلافی مسائل سے دامن بچتے ہوئے اپنی بات سادگی اور صفائی سے پیش کرنے پر حاوی ہیں۔ ان کی تحریر متانت کے باوصف دلچسپ اور دلکش ہے، پشاور یونیورسٹی ریڈیو پاکستان، ابا سین آرٹس کونسل اور دو سرے علمی اداروں نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اعزازات و انعامات سے نوازا ہے، "حیات محمد" بہادر شاہ ظفر، قائد اعظم اور صوبہ سرحد اور دوستان خیبر کے بعد ان کی ضخیم اور دقیق تالیف "تاریخ صوبہ سرحد" نے ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح ان کی انگریزی کتابیں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ اب انہوں نے پیر بابا کی سوانح، تعلیمات اور خدمات پر قلم اٹھایا ہے وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا فیصلہ قارئین کرام کو کرنا ہے۔

میرے نزدیک تو یہ کاوش اس اعتبار سے قابل داد ہے کہ ایک ولی اللہ اور عارف کامل کا تذکرہ مرتب کرتے ہوئے انہوں نے ادبیات کرام کے عام تذکرہ نویسوں کی روش سے ہٹ کر ایک اچھوتا، دلکش اور دلچسپ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے جسے صحیح طور پر سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ادبیات کرام اور صوفیائے کرام کے حقیقی مشن تبلیغی کارناموں اور مجاہدانہ کاوشوں کی آگاہی کے ساتھ ساتھ پہلے تصوف کی حقیقت و ماہیت اور مسلک صوفیاء کے متعلق علمائے راسخین کی گراں قدر آمار کو جاننا ضروری ہے۔

تصوّت کو سطحی نظر رکھنے والے بعض لوگ ایک بے کار اور دوزخ حقیقت امر شمار کرتے ہیں۔ لیکن جاننا چاہیے کہ تصوّت کوئی نئی چیز ہے نہ کتاب و سنت سے درمیش۔ جس طرح ظاہری علوم کی کسی شاخیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں منظر عام پر نہ آئی تھیں اسی طرح تصوّت بھی اپنی موجودہ شکل میں ان دنوں موجود نہ تھی۔ بعد میں علمی ترقی کے دروازے کھلے تو جس طرح دوسرے اسلامی علوم کی تدوین عمل میں آئی اسی طرح تصوّت نے بھی ایک مکتب فکر کی صورت اختیار کر لی۔ تصوّت کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم مشن کے تین ارکان پر غور کریں۔ قرآن پاک کے الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریق تعلیم کے تین نمایاں پہلو تھے۔ (۱) يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ (۲) وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۳) وَيُزَكِّيهِمْ۔ یعنی اول آیات قرآنی اور احکامات ربّانی کا زبانی بیان فرمانا۔ دوم قرآن و حکمت یا تفقہ فی الدین سکھانا اور سوم باطن کا تزکیہ، یعنی تصفیۃ قلب و نفس کرنا۔ آخر الذکر رکن یعنی دل کی صفائی اور تزکیۃ نفس بہت اہم ہے اور قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اس کی اہمیت کو مزید واضح کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "قَدْ اَخْلَجَ مِنْ زَكَاةٍ" (آخرت میں وہی کامیاب اور سُرخرو ہوگا۔ جس نے نفس کا تزکیہ کر لیا) گویا تصفیۃ قلب اور تزکیۃ نفس ہی پر آخرت کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ یہی آیت "تصوّت" پر دلالت کرتی ہے۔ تزکیہ و تصفیۃ باطن کا یہ عمل صحابہ کرامؓ کے نفوس طیبہ میں مشکوٰۃ بڑت سے براہ راست آپؐ کی صحبت مبارکہ اور توجہات عالیہ سے رونما ہوا۔ صحابہ کبار رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین سے یہ فیض تابعین اور تابعین سے تبع تابعین تک پہنچا اور بعد میں یہ سلسلہ بطریقہ بیعت صوفیائے کرام رائج ہوا۔ طریق بیعت صوفیاء بقول حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ مسنون طریقہ ہے اور اس کے سنت ہونے پر تمام علمائے اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسانی نفس کا تزکیہ نہ ہو۔ عبادت کی صرف صورت ہی صورت حاصل

ہوتی ہے۔ حقیقی ذوق اور لذت عبادت اور اس کی قبولیت عند اللہ کا دار و مدار قلب کی صفائی اور نفس کی پاکیزگی پر ہے۔ تصوف کی حقیقت اور اس کے مشروع ہونے کے بارے میں علماء کرام نے مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں سے چند ایک صوفیائے عظام کے اقوال مشتمل نمونہ از خردوارے کے طور درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ حضرت ابوسلیمان دارانی کا قول **فرماتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے دل پر صوفیائے کرام کے نکات**

دارو ہوتے ہیں اور کئی دنوں تک دارو ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جب تک کتاب و سنت کے دو گواہ ان کی تائید نہیں کرتے۔ میں انہیں قبول نہیں کرتا۔"

۲۔ حضرت سہل تری کا قول **ہمارے سات اصول ہیں (۱) قرآن کریم کی پابندی (۲) سنت نبویؐ کا اقتدار**

۳۔ حضرت المحاسبی کا قول **رہا اکل حلال (۴) کسی کو دکھ نہ دینا (۵) گناہوں سے پرہیز (۶) توبہ (۷) ادائے حق جس نے مراقبہ اور اخلاص کے ذریعے اپنا باطن درست کر لیا اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور**

اتباع سنت سے مزین کیا جاتا ہے۔

۴۔ سید الطائف حضرت جنید بغدادی کا قول **(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے والوں**

کے سوا تمام لوگوں کے لئے قرب الہی کے راستے بند ہیں۔

(ii) جس شخص نے نہ قرآن یاد کیا نہ حدیث لکھی ہو، طریقت میں اس کی پیروی نہیں کی جاسکتی۔

(iii) ہمارا مذہب اصول کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ سے مقید ہے۔



حضرت شیخ بقابن بطور سیدنا حضرت شیخ  
عبدالقادر جیلانیؒ کے ہم عصر تھے اور صاحبِ کرامت

## ۵۔ حضرت شیخ بقابن بطور کا قول

ہستی تھے۔ ان کے متعلق حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اکثر مشائخ کو ناپ ٹول کر معرفت عطا فرمائی ہے مگر انہیں یہ دولت بے اندازہ عطا کی گئی ہے۔ ان کی اسے حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی کے متعلق یہ ہے کہ "شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا طریقہ ہر طرح کتاب و سنت کے موافق تھا۔"

ایمان اور اتباع سنت سے بڑھ کر کوئی

## ۶۔ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کا بیان

کرامت نہیں، جسے یہ دونوں حاصل ہو جائیں

اور پھر وہ کسی اور چیز کا مشاق ہو تو وہ شخص مفتری اور کذاب ہے یا اسے اپنے علم کے اندازے میں غلطی لگی ہے۔ اس کو مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک شخص کو بادشاہ کے دربار میں حضوری کا شرف حاصل ہو گیا ہو مگر وہ جانوروں کا داروغہ بننا چاہے۔

تصوف کی تشریح اور صوفی کی تعریف میں صوفیائے کرام کے یہ چند اقوال اس لئے درج کیے گئے ہیں کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں پر واضح ہو جائے کہ مولف موصوف ظال اللہ عمرہ و زاد وعزہ نے اعلیٰ حضرت غوث زمان پیر بابا علیہ الرحمۃ کی زندگی کے ہر گوشے کو سابقہ بزرگانِ کرام کے اقوال و احوال کی روشنی میں پرکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت پیر باباؒ کی ساری زندگی ترویجِ قرآن و سنت کے لئے وقف رہی، انہوں نے اپنے اسوۂ حسنہ کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ دن رات ان کی تعلیم و تربیت کی، محبت اور شفقت سے انہیں دین کی طرف مائل کیا۔ اپنے کردار کی طاقت اور اخلاقی بلندی سے لوگوں کے دل رام کئے، جو ان کے پاس بیٹھا، اٹھا انہی کے رنگ میں رنگا گیا اور اس طرح انہوں نے اپنے پورے ماحول کو متاثر کرتے ہوئے اپنے حوالی میں ایک خوشگوار اسلامی انقلاب برپا کیا۔ ایسا انقلاب جس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جلتے ہیں اور تا ابد

محسوس کئے جلتے رہیں گے

ان صوفیائے کرام اور خود حضرت پیر بابا کے قول و عمل سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ اہل تصوف کا مقصد اعلیٰ اہل سنت والجماعت کے عقائد پر کاربند ہو کر اپنے نفس کو احکام شریعت کا اس قدر پابند بنانا ہے کہ خواہشات نفسانی کے آثار بالکل مٹ جائیں صوفی رفتہ رفتہ حقیقی اطمینان کی دولت سے فیض یاب ہو اور ذکر حق سے ذات حق کی معرفت کی رسائی حاصل کر کے **فَاذْخُلْ فِي عِبَادِيْ وَاذْخُلْ جَنَّتِيْ** کی بشارت سے نواز آجائے یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ معجزہ بنی اور کرامت ولی حق ہیں مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ بنی معجزہ کو ظاہر کرنے پر مامور ہے جب کہ ولی کے لئے کرامت کو چھپانا بہتر ہے۔ بقول حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کرامت معیار ولایت نہیں ہے۔ کرامت احد خرق عادت کے واقعات کے ظہور میں مسلمان اور دیگر مذاہب کے جوگی اور راہب وغیرہ مشترک ہیں۔ لہذا ولایت کا معیار کمال اتباع سنت میں ہے۔ شیخ المشائخ حضرت سید بہاؤ الدین نقشبندؒ "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" کی تائید میں فرماتے ہیں

ما برائے استقامت آدمیم نے پتے کشف و کرامت آدمیم  
یعنی ہم کتاب و سنت پر استقامت کے لئے آتے ہیں نہ کہ محض اظہار کشف و کرامت  
کئے۔

"خزینۃ المعارف" (ترجمہ ابوبیراز ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب) کے صفحہ ۵۸۸ پر نقل کیا گیا ہے کہ "جن لوگوں نے کرامات اولیاء کے متعلق کتابیں لکھی ہیں اگرچہ انہوں نے لوگوں کو اولیاء اللہ کی نشان دہی کر کے بڑا فیض پہنچایا ہے تاہم ایسی تالیفات سے جہاں عوام کو فائدہ پہنچا رہا ہے وہیں انہیں بہت سا نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے اس لئے کہ انہوں نے صرف اولیاء اللہ کی کرامات کے بیان پر اکتفا کیا ہے

انداز امور فانیہ کا ذکر نہیں کیا جو اولیاء سے سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی

کتابوں کا پڑھنے والا کرامات ہی کرامات، تصرفات ہی تصرفات اور کشف اور کشف ہی دیکھتا ہے۔ تو ذہن میں یہ خیال جمالیتا ہے کہ ولی سے جس چیز کا بھی مطالبہ کیا جائے وہ اس کے پورا کرنے پر قادر ہوتا ہے، عاجز نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ ولی سے کوئی مخالفت شرع بات (خواہ بظاہر ہی میں کیوں نہ ہو) واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے عام قاری بڑے مفاسد میں پڑ جاتا ہے اور گمان کرنے لگتا ہے کہ ولی میں ایک خداوندی وصف پایا جاتا ہے اور وہ کسی بات کے کرنے سے عاجز نہیں ہوتا اور جو چاہے کرتا ہے۔

بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار بھی ہو جاتے ہیں کہ ولی میں معصوم ہونے کا وصف پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تو وصف نبوت ہے۔ پہلا وصف، یعنی کسی چیز کے کرنے سے قاصر اور عاجز نہ ہونا محض خدا کا وصف ہے جو اولیاء اللہ تو کیا بڑے بڑے نبیوں کو بھی عطا نہیں کیا گیا۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں (انبیاء، کو کبھی فتح نصیب ہونا کبھی شکست، کبھی دعاؤں کا قبول ہونا کبھی نہ ہونا وغیرہ)۔ دوسری بات ولی کو معصوم خیال کرنا ہے۔ حالانکہ یہ وصف صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ ولایت کبھی نبوت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ ولی کے ہاتھ پر جو خیر و برکت ظاہر ہوتی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت کی بدولت ہوتی ہے۔ ولی کی ذات تو عام لوگوں کی طرح ہوتی ہے جب کہ انبیاء کرام پیدائشی معصوم ہوتے ہیں۔ کہ وہ اللہ کی معرفت اور تقویٰ پر پیدا کئے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی شریعت کے تابع ہوتے ہیں نہ کسی استاد کے محتاج ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے اپنی کتابوں کو محض کراماتِ اولیاء کے ذکر تک محدود رکھا ہے اگر وہ ان میں امور صالحہ کے ساتھ امورِ قانیہ کا بھی ذکر کر دیتے تو لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ کبھی ولی کی دعا قبول ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ کبھی وہ کسی بات کا

ارادہ کرتا ہے تو وہ بات پوری ہو جاتی ہے اور کبھی پوری نہیں ہوتی۔ ولی میں ایک اور بات بھی ہوتی ہے کہ کبھی اس کے ظاہری اعضاء سے اطاعت کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی مخالفت کا (اگرچہ اس مخالفت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے) البتہ ولی کے اندر ایک کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے جو گناہ سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ گویا ولی محفوظ تو کہلا سکتا ہے۔ معصوم نہیں کہلا سکتا کہ معصوم ہونا صرف انبیاء کرام کا خاصہ ہے۔

بہت سے لوگ جب اولیاء کرام کے بارے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو انتہائی وفور عقیدت کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ تو اپنے ذہن میں وہ تصویر بناتے ہیں جو انہوں نے ان سوانح عمریوں کے مطالعہ کے نتیجے میں بنائی ہو۔ پھر جب وہ بزرگان سلف کی کرامتوں کا موازنہ اور مقابلہ اپنے زمانے کے اولیاء کرام کے ساتھ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دورِ حاضر کے اولیاء میں وہ کرامتیں موجود نہیں تو وہ شک و شبہات کا شکار ہ جاتے ہیں بلکہ بعض لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سرے سے انکار کرنے لگتے ہیں کہ اب بھی کوئی ولی موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے خیالی اور کُلی ولی کا تصور اور یقین کرنے لگتے ہیں جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ ایسے سادہ لوح لوگوں پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ولایت کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے فلاں بندے کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا و بقول فرمان خداوندی اللہ یَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ بِرِئْضِ اللَّهِ دِينِ اَوْ عَنَانِ اَيْتِ هِيَ، کیونکہ اس انتخابِ خداوندی کے لئے انسان کوئی ضابطہ مقرر نہیں کر سکتا۔ گویا ولایت بھی کسی نہیں بلکہ وہی چیز ہے اللہ جسے چاہتا ہے۔ اس نعمت سے نواز دیتا ہے۔

یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں فاضل مولف نے اس اہم نقطہ نظر کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور عام تذکرہ نگاروں کی طرح اس کتاب کو محض کشف و کرامات

کا مجموعہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ کتاب میں حضرت پیر باباؒ اور ان کے متعلقین کے افکار و نظریات، ان کی اصلاحی مہم اور مبلغانہ اور مجاہدانہ کارناموں کو عمدہ پیرائے میں بیان کرنے کی قابل تلاش سعی کی گئی ہے۔ کتاب کا مطالعہ مجموعی اعتبار سے قاری کے دل میں دین اسلام کے احیاء کی ضرورت، کتاب و سنت کی ترویج اور دین حق کی خاطر اشیاء و قربانی کا جوش اور جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسی جوش و جذبے سے کام لے کر ہم آج کے پیش آمدہ مسائل سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اللہ کریم ان تمام ساتھیوں کو جزائے خیر دے جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں حصہ لیا۔

جزاہم اللہ احسن الجزاء

قاضی عبدالداؤد و ائم  
 سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ  
 مدیر اعلیٰ ماہنامہ "جام عرفان"  
 ہری پور (سہارنہ)

# مقدمہ

”میری جان کی قسم! اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے اور کہیں بھی اس میں زندگی کی رتق باقی نہ رہے تو بھی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ ہندو کش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا اور ان کا عزم جواں رہے گا۔“  
 نامور عرب مؤرخ اور مفکر امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں اہل سرحد کے اسلامی کردار کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ فخر بھی سر زمینِ سرحد کو حاصل ہے کہ یہاں کی اہل آبادی پختون، پشتون یا پٹھان سب کی سب مسلمان ہے۔ معروف دانش ور میر عبدالصمد خان مرحوم کی یہ وضاحت اس سلسلے میں قابلِ غور ہے کہ

”حقیقت میں پختون ایک ایسی قوم کا نام ہے جو کلمہٴ مسلمان ہیں۔ اس قوم کی حقیقی تاریخ کا آغاز ظہورِ اسلام ہی کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہے۔ پختونیت اور اسلام کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ پختون اور مسلمان مترادف الفاظ بن چکے ہیں، جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سچا اور عظیم پختون ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑا اور سچا مسلمان ہے۔“

پشتون اکادمی، پشاور یونیورسٹی کے رکن پورول خان خشک پشتونوں (اہل سرحد) کے اس اسلامی کردار پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں :-

”روسے زمین پر صرت اور صرف پختونوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ کوئی پشتون اسلام قبول

کئے بغیر اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا جو شخص دائرہ اسلام سے نکلا پشتون برادری سے بھی خارج ہو گیا۔ لہذا پشتون اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ انہوں نے اسلام کے پیغام اور تعلیمات کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا ہے۔

جب بھی اسلام پر کٹھن وقت آیا یا کسی غیر مسلم طاقت نے مسلمانوں کو لٹکارا تو سرحد پاکستان پر آباد یہ غازی سر بکف میدان میں اترے اور انہوں نے از سر نو مسلمانوں کو نئی قوت اور حوصلہ عطا کیا۔ ”تذکرہ صوفیائے سرحد“ کے مؤلف مولانا اعجاز الحق قدوسی اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

”قرب تھا کہ وہ شمع جس کو عرب کے غازیوں نے برصغیر پاک و ہند کی واڈی سندھ میں روشن کیا تھا، داخلی اختلافات کی وجہ سے گل ہو جائے کہ اچانک اسے خیر کے راستے ایک نئی طاقت ملی اور پرچم اسلام اس سرزمین میں سرنگون ہونے سے بچ گیا۔ اس مرتبہ اس کا سہرا ان عینور و جسو افغانوں کے سر تھا جن کے رگ و زیشہ میں اسلام کچھ اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ ان کا ہر فرد شوق شہادت سے مست اور سرشار تھا۔“

حقیقت یہی ہے کہ کوہ سلیمان کے دروں کی راہ صرف نائتین اور طالع آزما مجاہد ہی برصغیر پاک و ہند میں وارد نہیں ہوتے رہے بلکہ ان لشکروں کے جلو میں بڑے بڑے علمائے دین، صوفیائے کرام، مبلغین عظام اور روحانی طبیب بھی آتے۔۔۔۔۔ جنہوں نے ہندوستانی لوگوں کے اذہان اور معاشرے کے افکار و روایات کو بھی پوری قوت سے متاثر کیا، یہ لوگ اسلام کے مشعل بردار بن کر آئے اور انہوں نے سارے برصغیر کو اسلامی تعلیمات کی روشنی سے منور کر دیا۔ انہوں نے مقامی رسم و رواج، بدعات اور جاہلی تعصبات کا خاتمہ کیا اور لوگوں کے سامنے اسلامی کردار کا عملی نمونہ پیش کیا۔ یہ صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ ایک سچے اسلامی معاشرے کے معمار تھے۔ وہ اللہ کے بندوں سے محبت کرنے اور ان کی بہتری اور بہبود کے طالب تھے، بقول حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا علیہ الرحمۃ وہ لوگوں کی ارشاد و ہدایت

میں کفر سے ایمان کی طرف، گناہ سے عبادت کی طرف، نفسانیت سے روحانیت کی طرف توجہ کرنے میں مصروف رہتے۔ — خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ ان کا نقطہ نظر صلح اور خیر خواہی کا تھا۔ "اللہ پاک کی ان برگزیدہ ہستیوں کی نگاہ بلند تھی اور انکار آفاقی تھے۔ وہ انسانیت کا درس دینے والے، زندگی کی اعلیٰ قدروں کا پرچم بلند کرنے والے اور انسانوں سے انتہائی محبت اور شفقت رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کے دروازے ہر چھوٹے بڑے، امیر غریب پر کھلے ہوتے تھے، وہ معاشرے کے دھتکاسے ہوؤں کو بھی گلے لگانے اور ان کی فلاح و بہبود سے دلچسپی لینے والے لوگ تھے ایک غیر مسلم کے قبولِ اسلام سے انہیں جتنی خوشی ہوتی شاید اس سے زیادہ خوشی ایک مسلمان کے ترکِ گناہ سے ہوتی۔ ان کا نظام، نظامِ تربیت اور نظامِ صحبت تھا۔ ان کے ضمیر روشن تھے۔ ان کی مجلس میں اٹھنے بیٹھنے والے ہر شخص کا دل اس روشنی سے منور ہوتا۔ چراغ سے چراغ جلتے اور رفته رفته پورا ماحول اور معاشرہ نیکی اور خیر کی روشنی سے منور ہو جاتا۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ برصغیر میں اسلام زیادہ تر صوفیائے کرام ہی نے پھیلایا۔ صوبہ حشر کے دور دراز پہاڑوں، گھاٹیوں، جنگلوں اور ویرانوں تک اسلام کی روشنی پہنچانے کا سہرا اپنی صوفیائے کرام کے سر ہے، آج اگر صوبہ سرحد کے کونے کھدے تک کے رہنے والوں میں اسلام سے والہانہ وابستگی، اسلامی شعار کی پابندی اور عقائد کی سختگی پائی جاتی ہے تو یہ اپنی اولیاء اللہ کی مساعیٰ و جمیلہ اور تجلیات الہیہ کا نتیجہ ہے ورنہ ان میں سے اکثر علاقے ایسے ہیں جہاں تک کسی مسلمان فاتح یا حملہ آور کے قدم نہیں پہنچے تاریخ پس منظر میں دیکھا جائے تو ان اولیاء اللہ کے کارنامے محیر العقول نظر آتے ہیں پشاور، تحت بھائی، شہباز گڑھ، منگور، ٹیکسلا اور دوسرے

مقامات کے عجائب گھروں اور آثارِ قدیمہ کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک وقت تھا جب اس سارے علاقے میں بودھ مت کا طوطی بول رہا تھا۔ چینی سیاحوں کے کہنے کے مطابق بیٹھوسے سوات تک بسکڑوں کے کنائے آبادیوں میں ہر وقت مندروں کی گھنٹیوں کی آواز فضاؤں میں گونجتی رہتی تھی۔ گویا ان صدیوں کے علاقوں کی ساری آبادی مشرک بت پرست اور



توہمات کا شکار تھی، پہاڑوں کے ایک ایک غار میں بت سجا تے جلتے تھے، بت تراشی کا کام پہا  
 انتہائی عروج پر تھا اور آج بھی فن کے شیدائی گندھارا آرٹ کو مجسمہ سازی کا کمال فن قرار دیتے ہیں  
 مٹتے نمونہ از خروارے کیلاش اور کافرستان کی تہذیب اور وہاں کے لوگوں کی مذہبی رسوم اور  
 عجیب و غریب عقائد اور دستوریں آج بھی ان کو ہستانی علاقوں کے قدیم باشندوں کی زندگی اور  
 رہن سہن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ — آخر یہ عظیم الشان فکری اور ذہنی انقلاب ان علاقوں  
 میں کیسے رونما ہوا؟ — وہ کون بہتیاں تھیں جن کی کوششوں کے نتیجے میں یہ مبارک اسلامی  
 انقلاب برپا ہوا؟ — یقیناً وہ صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ ہی تھے جن کو اللہ نے یہ سعادت  
 بخشی کہ انہوں نے اسلام اور اسلام کی تعلیمات کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیا۔ انہیں کفر  
 کی تاریکیوں سے نکال کر اسلامی تہذیب کی برکتوں سے مالا مال کر دیا۔ انہیں اس خوبی سے  
 اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا کہ صدیوں گزر جانے پر بھی یہ لوگ اسلام کے اسی طرح شیدائی ہیں  
 اور اللہ اور اللہ تعالیٰ کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سر بلندی کے لئے ہر قسم  
 کی مالی اور جانی قربانی دینے پر ہر وقت تیار اور مستعد نظر آتے ہیں۔

صوبہ سرحد کے ان سرحدی اور کوہستانی علاقوں تک اسلام کا روح پرور پیغام پہنچانے  
 کی اولیت کا سہرا غوث خراسان۔ قطب زمان، اعلیٰ حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف  
 پیر بابا بونیری رحمۃ اللہ علیہ کے سر ہے۔

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کا دینی اور تبلیغی کارنامہ اس قدر مہتمم بالشان ہے کہ اس کے  
 اثرات اور ثمرات آج تک جاری و ساری ہیں، ان کی عزت و عظمت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ  
 گھٹنے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے ان کا حلقہ ارادت وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور ان کی  
 شہرت زمان و مکان کے تقاضوں سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے، سوات، بونیر، کوہستان اور نہراہ  
 سے لے کر وزیرستان کے مقامات ٹانک، وانا اور جندولہ تک اور خیبر کے وڑے سے مارگلہ  
 کی پہاڑیوں تک ہر جگہ ان کے نام لیوا موجود ہیں۔ ان پڑھ اور اُچھ دیہاتی بھی ان کے نام

کا احترام کرتا اور ان کا وظیفہ پڑھتا ہے، عرس کے دنوں میں بسوں اور ٹرکوں پر، کاروں اور ویگنوں پر، تافلوں اور ٹولیوں کی صورت میں سرخ اور سبز جھنڈے اٹھائے ہوتے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ باچا کلی بونیر کی جانب رواں دواں نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی جوش اور جذبے سے حضرت پیر باباؒ کے مزار پر پہنچ کر نذر و نیاز گزارتے، — مزار شریف سے ملحقہ مسجد میں نفل ادا کرتے اور ذکر و فکر میں غور نظر آتے ہیں۔ سارے صوبہ سرحد اور مشرقی افغانستان میں شاید ہی کوئی شیدائی اسلام ایسا ہو جو حضرت پیر باباؒ کے نام نامی اور ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔

حضرت پیر باباؒ کے کمالات کا اس لئے بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے کوہستان کے ان کو کونوں کھدروں تک بھی اسلام کا پیغام پہنچایا جہاں کسی دو سکر مبلغ اسلام یا فاتح کے قدم نہ پہنچ سکے۔ جن لوگوں نے کوہستان کے یہ علاقے دیکھے ہیں یا جو پہاڑی سلسلوں سے گھرے ہوئے ان دور دراز اور دشوار گزار علاقوں کی جغرافیائی پوزیشن کا علم رکھتے ہیں، وہ وہاں کے لوگوں کی پسماندگی، لاعلمی، افلاس و ناداری اور توہم پرستی سے پوری طرح آگاہ ہیں، ان لوگوں میں تبلیغ و اصلاح کا پرچم بلند کرنا اور انہیں صراطِ مستقیم دکھانا حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ جیسے عالی حوصلہ اور پر عزم بزرگوں ہی کا کام ہے اس اعتبار سے حضرت پیر باباؒ کو ان کی انسانی دوستی اور خدمتِ خلق کے پیش نظر ”مصلحِ عظیم“ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت شہنشاہ خراسان پیر سید علی غواصؒ نے کچھ اس شان سے لوگوں کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کیا اور کچھ ایسے انداز سے انہیں راسخ الاعتقادی اور خود اعتمادی سے نوازا کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی دین کی راہ پر ان کے قدم ڈگمگانے نہ پاتے، ان علاقوں کے لوگ نہ صرف ان کی ارادت اور عقیدت کو گلے لگائے رہے بلکہ مسلکِ ابوحنیفہ راہل سنت و الجماعت پر کاربند رہے، کوئی دوسرا مذہب ان سارے علاقوں میں جڑ نہ پکڑ سکا۔

اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ بوئیر کے لوگ حضرت پیر بابا کے وہاں پہنچنے سے پہلے کن مذہبی عقائد کے پیروکار تھے تاہم غالب قیاس یہ ہے کہ کیلاش کافرستان اور دوسرے علاقوں کی طرح وہ اس وقت تک شجر و حجر پرستی کے چکر میں گرفتار تھے۔ قبیلے قبیلے کا مسلک جداگانہ تھا اور یہ عین ممکن ہے کہ اپنی جہالت اور سپماندگی کی بدولت وہ محض لاندہب ہی ہوں اور الگ تھلگ زندگی گزارنے کے باعث اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں ہی پر کار بند ہوں، اس پس منظر میں حضرت پیر بابا کی تبلیغی مساعی کی قدرو قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کے دلوں کو ایمان کی روشنی بخشنے اور انہیں تہذیب و تمدن کے نور سے متور کرنے پر انہیں اپنے دور کا "مصلح اعظم" تسلیم کئے بغیر نہیں پڑتی۔

حضرت پیر بابا کی مشکلات کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو سرحدی علاقوں کی قبائلی خصوصیات سے آگاہ ہوں، یہ لوگ صدیوں سے الگ تھلگ زندگی گزارتے چلے آ رہے ہیں اور تاحال موجودہ تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت سے قریب قریب بالکل بے بہرہ ہیں۔ یہ لوگ یا تو بھیڑ بکری پال کر گذران کرتے ہیں۔ جہاں ممکن ہو پہاڑوں کو کاٹ کر کھیت بناتے اور جو، جوار اگاتے ہیں۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر علاقہ دوسرے علاقے سے الگ تھلگ ہے، پہاڑی ندی نالوں کی کثرت کی وجہ سے راستے دشوار گزار ہیں اور علاقہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ ہر علاقے تک پہنچنا اور ہر جگہ لوگوں تک پیغام محمدی پہنچانا بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ دوسرے کا دشمن اور ہر شخص دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ لوگ نوشت و خواند سے بے بہرہ ہیں، اس دور میں نہ اخبار تھے نہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن — ان سارے موافقات اور ان ساری مشکلات کے باوجود پیر بابا عزم و ہمت کا پہاڑ بنے رہتے ہیں۔ وہ فقیر تھے نہ کہ بادشاہ — فقیر مادی وسائل سے محروم ہوتا ہے اور محض روحانی اور اشراقی قوتوں کے کام لیتا ہے، وہ خود اپنی ذات کو لوگوں کے سامنے ایک نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے

اس کی زبان پر اللہ کا بابرکت پیغام ہوتا ہے اور اس کا دل تجلیات الہیہ کا مسکن و مرکز  
یقیناً جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ یہ حضرات کتابیں نہیں لکھتے  
انسانوں کی سیرت سازی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، انہیں کاغذ، قلم، دوات کی حاجت  
نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنے خونِ جگر سے گلشنِ انسانیت کو سیراب کرتے ہیں۔ ان کی  
کوششوں اور اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم سے خزاں زدہ انسانیت بہارِ آشا ہوتی ہے، وہ ابر کرم کی  
مانند برستے ہیں تو بنجر زمینیں بھی شربار اور گل بکبار ہو جاتی ہے۔

ایک عام انسان اپنے آپ کو ماحول میں گم کر دیتا ہے۔ زمانے کے رنگ میں رنگا  
جاتا ہے لیکن مردانِ حق زمانے اور حوادثِ زمانہ کا رخ پلٹ دیتے ہیں۔ وہ ماحول کو  
متاثر کرتے اور اپنے پاس بیٹھنے والوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ دیکھا  
جاتے تو اسلام ایک طرح کا نظامِ صحبت اور نظامِ تربیت ہی تو ہے، اس نظامِ صحبت میں  
مرکزی نقطہ خود پیغمبر اسلام، سید الانام، خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین جناب محمد رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی سیرت مطہرہ اور اسوۂ حسنہ ہے۔ اسلام کی تاریخ اس حقیقت  
پر شاہد ہے کہ جتنا کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیادہ قریب رہا۔ ان کے رنگ  
میں زیادہ رنگا گیا اور شیدائیانِ حق نے اسی طریقِ نبوت کو اپنایا۔ اَلْفَقْرُ فَنَحْرِيْ بِرِ  
عمل شروع کیا۔ ان ہستیوں کے اخلاقِ فاخرہ کو دیکھ کر لوگ خود ان کی طرف کھینچے گئے۔  
ان اہلِ محبت نے لوگوں کے دلوں میں عشقِ رسول اور اطاعتِ الہی کی شمعیں روشن کیں،  
لوگوں سے ترکِ گناہ کی بیعت لی۔ اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیت کی، نفوس کا تزکیہ ہوا  
تو اصلاحِ امت خود ظہور میں آتی گئی، لوگ ذاتِ پات، اوپنج پنج، طبقاتی کش مکش، قبائلی  
اور گروہی عداوتوں اور تعصبات کو بھول کر اللہ اور رسول کے احکام کی اطاعت کی طرف  
متوجہ ہوتے گئے۔ جاہلی رسوم و رواج کا خاتمہ ہوا، کفر اور شرک کی ظلمتیں چھپ گئیں،  
توحید و رسالت کا آفتاب عالمیاب طلوع ہوا۔ ساری فضا اور سارا ماحول نورِ ایمانی سے  
منور ہو کر جگ جگ، جگ جگ کرنے لگا۔ صوبہ ہند کے کوہستانی علاقوں میں پیر بابا، سید علی

غواص ترمذی علیہ الرحمۃ اللہ والوں کے اسی قافلہ خدمت کے سرخیل تھے جو تمام مقامات دینی سے قطع نظر کر کے انتہائی بے غرضی سے محض ذکرِ خدا اور عشق و اطاعت رسول کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے اور صدق و صفا اور سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر کاربند ہو جاتا ہے۔ — ان حضرات کرام کے نزدیک تقویٰ کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباعِ کتاب و سنت میں انتہائی سعی کی جائے، اسوۂ رسول و صحابہ کرامؓ کو دلیلِ راہ سمجھا جائے۔ اور امر و نواہی کی تعمیل کی جائے۔ طاعات و عبادات کو مقصودِ حیات سمجھا جائے قلب کو محبت اور تعلق ماسوا سے پاک کیا جائے نفس کو خشیتِ الہی سے مغلوب کیا جائے اور حسن معاملت اور تزکیہ باطن کے حصول میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے پائے۔ خلوص اور محبت کے دو الفاظ تقویٰ کی روح ہیں۔ — ظاہر کی بجائے صوفیائے کرام نے باطن کی طہارت پر زور دیا۔ — کیونکہ باطن متاثر ہوتا تو انسان کے افکار میں انقلاب آجاتا ہے اور افکار کا انقلاب ہی عملی انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے، ایک چیز صرف قبولِ اسلام ہے اور ایک ایمان کا دلوں میں اتارنا ہے۔ — ایک مسلمان ہونا ہے اور ایک مومن ہونا۔ — حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ اور حضرات صوفیہ کا کام لوگوں کو قلب و نظر کی روشنی بخشنا اور ان کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں اسلام کی سیدھی راہ پر ڈال دینا ہی تو تھا۔

آج کل تقویٰ اور فقر کا نام لیتے ہی ذہن کسی تارک الدنیا، گوشہ نشین، زاہد خشک کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ماڈرن ذہن ایسے "تقویٰ" سے "الرجح" ہے لیکن اس ماڈرن ذہن کو کون سمجھائے کہ اہل اللہ تو عام لوگوں سے زیادہ فعال اور عملی ہوتے ہیں۔ — ان کا اسلام عملی اسلام ہوتا ہے، ان کے پیش نظر خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہوتا ہے حضور کی زندگی میں غارِ حرا کی تنہائیاں، مراقبے اور مجاہدے بھی ملتے ہیں۔ خود کئی کئی دن تک بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلانے کی مثالیں بھی موجود ہیں، سب کچھ راہِ خدا میں ٹھانے کے واقعات بھی ہیں اور بدر و حنین کے خونِ معرکوں

میں سرہتھیل پر رکھ کر اپنے ہی خون میں نہانا بھی ہے۔ — مختصراً اللہ تعالیٰ اور رسول خدا ﷺ  
 کے احکام اور منشاء کے عین مطابق زندگی بسر کرنا ہی اہل اللہ کا مقصود اور نصب العین  
 ہے۔ خلوت و جلوت، سفر و حضر، تونگری اور ناداری، خوشی اور غم ہر حالت میں اللہ پاک  
 کی ذات پر بھروسہ رکھنا اور اسلام کا دامن تھامے رکھنا ہی روح ایمان اور روح تصوف کے  
 بات صرت اتنی ہے کہ طریقت و شریعت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں کوئی لفظ اور کوئی خطاب صحابی سے بڑھ کر نہ تھا اور  
 صحابی کا شرف اسی میں تھا کہ وہ حضور انور ﷺ کی صحبت اور تربیت سے فیض یافتہ تھے۔ ان  
 کے بعد صحابیوں کے صحابیوں کے لئے تابعین کا نام تجویز ہوا۔ پھر ان کی آنکھیں دیکھنے والے  
 تبع تابعین کہلاتے۔ — بعد میں اہل سنت کے طبقہ خاص نے جو ذکر الہی  
 میں مشغول رہتا اور اسوۂ رسول ﷺ پر کار بند رہنے کی سعی کرتا اپنے لئے اہل تصوف کا  
 اصلاحی نام اختیار کیا۔ — گویا مینائے تصوف اور دولت ایمان و عرفان دست  
 بدست آگے بڑھتی رہی اور زمانے اور ہر دور میں اللہ والوں کا ایک گروہ ایسا رہا جس  
 کا نصب العین اشاعت و تبلیغ دین رہا۔ کوئی دور ان حضرات کرام سے خالی نہیں گذرا  
 — تصوف ایک اشرافی طریق کار ہے جس کی بدولت مرشد کے قلب سے اٹھنے  
 والی روشنی مرید کے دل کو منور کرتی اور اسے عشق الہی کی لذت عطا کرتی ہے۔  
 رہا یہ کہ صوفیاء کی ضرورت کیا ہے؟ — تو اس کا جواب یہی ہے کہ ہر فن اور ہر شعبہ  
 علم کی تحصیل کے لئے اتنا ذکا ضرورت ناگزیر ہے۔ روحانیت کے علم میں جو ان تمام علوم  
 سے بالاتر ہے، اتنا ذکا مرشد اور رہبر کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے۔ — ایک عام استاد  
 کا کام شاگرد کو ظاہری علوم سے آراستہ کرنا ہے جب کہ شیخ طریقت (بقول مفسرین قرآن علیہ السلام) حقیقی  
 — — — — — وہ مصلح ہوتا ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ اپنی ہم نشینی سے دوسروں  
 کی فطری صلاحیت کو ابھار سکے پس مرید ہونے یا بیعت میں داخل ہونے کے معنی اس

کے سوا کچھ نہیں کہ جس ہستی کے صراح و صادق ہونے پر بھروسہ ہو اور جس کی شانِ طاعت و تقویٰ سے اپنا ضمیر و وجدان مطمئن ہو، اس کے اتباع کا قصد و اہتمام کیا جاتے اور اطاعت و نیاز مندی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر دی جاتے۔

گویا شریعت اور طریقت کوئی جدا جدا عمل نہیں — اور شریعت کے نقطہ بحال ہی کا نام طریقت ہے: ظاہری عبادات کے ساتھ ساتھ اگر قلب و باطن نورانیت سے منور ہوں تو عبادات میں جو لذت اور کیفیت و سرور ملتا ہے اس کا اندازہ صرف اہل محبت ہی لگا سکتے ہیں۔ پیر و مرشد کا قلب چونکہ واسطہ در واسطہ، سلسلہ بہ سلسلہ مرشد کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک سے جڑا ہوتا ہے اس لئے اس کا طریقِ تعلیم و تربیت زیادہ موثر اور مفید ہوتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس اُمت میں ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسی کامل ہستیاں پیدا ہوتی رہیں جو لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی رہیں — ان حقیقی ناسبانِ رسول اور مصلحین کے زندہ نمونے ہر دور میں موجود رہے اور عامۃ المسلمین ان سے فیض پاتے رہے — ضرورتِ بیعت اور نظامِ طریقت کے بارے میں عظیم مفکر اور دانش ور حضرت شاہ ولی اللہ رسالہ "القول الجمیل" میں رقم طراز ہیں کہ

”بیعت سنت رسول اللہ ہے اور بیعت کا اطلاق صرف بیعتِ خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوت میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں مثلاً بیعتِ خلافت، بیعتِ جہاد اور بیعتِ توبہ — صورتیہ کی مروجہ بیعت بیعتِ تقویٰ میں داخل ہے“

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی شریعت اور طریقت کی ہم آہنگی اور یگانگت کو یوں واضح کرتے ہیں کہ

طریقت عروجِ دلِ مصطفیٰ  
محبت کی لذت طریقت میں ہے  
طریقت میں ہے معنی شقِ صدر

شریعت در محفلِ مصطفیٰ  
عبادت سے عزت شریعت میں ہے  
شریعت میں ہے صورتِ فتح بدر





ان سے رجوع ہوتے، وہ نہ صرف ان کی تعلیم و تربیت کی بدولت ظاہری اور باطنی علوم سے بہرہ ور اور آراستہ ہوتے بلکہ پیر بابا کے اپنی ارادت مندوں کی بدولت اس سرزمین کے عوام تک اسلامی تعلیمات کی روشنی پہنچی۔ سلسلہ سلوک میں آپ کے مریدوں کے متعدد سلسلے ہیں جنہیں اکثر اخون خیل کہا جاتا ہے۔ ان میں پیر بابا کے مازون و خلیفہ مجاز حضرت اخون درویزہ کا نام سرفہرست ہے جو اپنے عہد کے متشرع مجاہد اور ولی اللہ ہو گئے ہیں۔ علاوہ بریں اسی ضمن میں اخون پنجو صاحب اور اس لڑی میں اخون درویزہ کے فرزند اخون شہید،

اخون سالاک، اخوند عمر، اخوند جی اور اخوند اللہ داد کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی اولاد اخوند خیل کہلاتی اور انہوں نے علم دین کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔

حضرت پیر بابا اور بالخصوص ان کے خلفاء اور اخلاف نے اپنی سرگرمیاں صرف خدمت دین

## پشتو ادب و زبان کی خدمت

تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ انہوں نے پشتون عوام تک اسلام کا پیغام اپنی زبان میں پہنچانے کے لئے پشتو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اس سے پیشتر پشتو کو ایک کم مایہ زبان سمجھا جاتا تھا اور تحریری سرمایہ صرف فارسی اور عربی ہی میں موجود تھا۔ حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ خود بھی عالم فاضل انسان تھے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے کسی کتابیں لکھی ہوں تاہم وہ کتابیں اب ناپید ہیں۔ البتہ ان کے خلیفہ خاص حضرت اخون درویزہ کی تصانیف پشتو نثر کی اولین تحریروں میں شمار ہوتی ہیں۔ شمس العلماء میر احمد شاہ رضوانی "بہارستان" میں اخون درویزہ بابا کی ادبی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اخون درویزہ پشتو ادب کے عین ہیں سے ہیں۔ انہوں نے پشتو زبان کے ارتقا میں غیر معمولی حصہ لیا اور پشتو میں کتابیں لکھ کر اس زبان کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ اسی لئے ان کا نام پشتو زبان کے خدمت گزاروں میں ہمیشہ عقیدت سے لیا جائے گا۔"

مشہور محقق عبدالحی حبیبی کے مطابق "اخون درویزہ" ایک آتش بیان خطیب، اثر انگیز مولف اور نہایت سخت گیر محتب تھے۔ پشتو، فارسی اور عربی میں تقریر کرتے تھے۔ شعر کہتے

تھے اور ان کا طریقہ و مخط بڑا موثر تھا۔

اخون درویزہ پشتون نثر کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مقفیٰ اور مسیح عبارت کے استاد تھے۔ وہ خاص طرز کے بانی ہیں۔ سبھی ان کی اس طرز کو اپنانے میں کوشاں رہے یہاں تک ان کے حریف بایزید انصاری (پیریشن یا پیرتاریک) کے پیروں میں بھی ان کی طرز نگارش نے رواج پایا۔ اس بنا پر پشتو ادب کی تاریخ میں نہ صرف اخون درویزہ بلکہ ان کے شاگرد اور ان کے خاندان کے افراد بھی بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں فارسی اور اردو زبان کی اشاعت اور فروغ میں صوفیائے کرام نے نمایاں حصہ لیا وہیں پشتو زبان و ادب میں اخون درویزہ بابا اور دوسرے صوفیاء بھی پیچھے رہنے نہ پاتے۔ "مخزن اسلام" تذکرۃ الابراہیم والاشرار۔" ارشاد الطالبین" اور شرح قصیدہ امالیٰ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

چونکہ پیر بابا سید علی غواص ترمذی، حضرت اخون درویزہ اور ان کے مخالفین بایزید انصاری اور اس کے ساتھیوں میں اکثر مناظرے پشتو میں ہوتے تھے اس لئے لوگ پشتو نظم و نثر کی طرف متوجہ ہوتے جہاں اخون درویزہ کے ساتھیوں اور مریدوں میں سے اکثر نے پشتو کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہیں بایزید انصاری کے مریدوں میں ملا ارزانی اور اس کے بھائیوں ملا عمر اور ملا علی نے پشتو شعر و ادب کو اپنی تحریروں کی بدولت مالا مال کر دیا۔ اسی گروہ میں مخلص اور میرزا خان انصاری جیسے شعرا بھی ہوتے۔

اخون درویزہ نے اپنی کتاب "تذکرۃ الابراہیم والاشرار" میں ملا ارزانی کی عقل و منہم اور قابلیت کی تائید کی ہے بلکہ اخون درویزہ کا خیال ہے کہ خیرالبیان کی تحریروں میں ارزانی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ارزانی خود اپنے اشعار میں "خیرالبیان" کے متعلق کہتا ہے کہ "یہ فقیر کا پشتو دیوان ہے، یہ دیوان حقانی دسترخواں ہے..... یہ چار زبانوں میں لکھا گیا ہے۔"

ایک اور جگہ ارزانی کہتا ہے کہ "فقیر کی پشتو باتیں موتی جیسی آبدار ہیں۔"

مختصراً حضرت پیر بابا سید علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے وابستگانِ دامن نے مسلمان عوام میں دینی روح بیدار کرنے ان کے اخلاق کو سنوارنے اور ان کی اصلاحِ باطن کے لئے بھرپور کوششیں کیں اور صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں اسلامی تعلیمات کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔

یہ شرف بھی حضرت پیر باباؒ کو حاصل ہوا کہ ان کی اولاد

## نامور اخلاف

میں ہر دور میں وہ نامور ہستیاں پیدا ہوئیں جن کے کارناموں

پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فخر کیا جانا ہے گا۔ ان میں سے اکثر حضرات تو روحانی اصلاح

کے علمبردار رہے جن کی سرگرمیاں منبر و محراب اور اصلاح و تبلیغ کے لئے وقف ہیں

اس لئے ان کے تذکرے تاریخ کے صفحات میں بار نہ پاسکے تاہم پیر بابا علیہ الرحمۃ کی مبارک

لڑی میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہیں دینی سیادت کے ساتھ ساتھ شمشیر و سنان سے

کام لیتے ہوئے دشمنانِ اسلام کے خلاف شاندار کارنامے بھی انجام دیئے۔ اس عظیم

خانوادہ کی عظیم ہستیوں میں سے سید اکبر شاہ، سید مبارک شاہ، سید عبدالجبار بادشاہ اور

سید انسادات، حضرت جمال الدین افغانی کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

سوات، بونیر، شمالی ہزارہ اور صوبہ سرحد کے اکثر

## سید اکبر شاہ ترمذی

دورانِ فساد مقامات ایسے ہیں جو کبھی کسی بیرونی طاقت

کے غلام نہیں رہے، یہ لوگ ہمیشہ آزادی کی نعمت سے سرفراز رہے، مغلوں کے ابتدائی

دور میں ان کا برائے نام الحاقِ دہلی دربار سے ضرور تھا تاہم اندرونی طور پر وہ اس وقت

بھی اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار ہی تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد

مغلیہ سلطنت پر زوال آیا تو یہ برائے نام وابستگی بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ ہر جگہ کا خانِ خود مختار

حکمران بن بیٹھا اور اپنی من مانی کرنے لگا۔ سکھوں کے دور میں ان علاقوں کی اتری طاقتِ الملوک

اور انارکھی انتہا کو پہنچ گئی۔ کوئی مرکزی اقتدار نہ رہا۔ ہر طرف قتلِ مقاتلوں خونِ غلابو

اور خانہ جنگی کا عالم تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا۔ ایسے میں حضرت

پیر بابا کی اولاد نے بڑا کام کیا۔ اپنے روحانی اثر و نفوذ کی بنا پر وہ ہر جگہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، جہاں کہیں اور جب کبھی دو قبیلوں میں ٹھن جاتی یہی سادات ترمذی بیچ میں آتے اور ثالث بن کر ان میں صلح کرا دیتے۔

سکھوں نے ہزارہ پر کچھ عرصہ حکومت کی لیکن اس سارے عرصہ میں انہیں صدر کے مجاہد اور حریت پسند قبائل سے متواتر مصروف جنگ رہنا پڑا۔ ہمارا جہ رنجیت سنگھ نے خود کئی بار ہزارہ کا رخ کیا۔ اسے وقتی طور پر کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں لیکن وہ بھی کوئی مستقل حکومت یہاں قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر مشہور سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ کی شکست کے بعد تو سکھوں کا یہ برائے نام اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک طاقت (سکھ) ختم ہو چکی تھی اور دوسری طاقت (انگریز) میں ابھی اتنی سکت نہ تھی کہ زمام اختیار سنبھال کر امن و امان بحال کیا جاتے۔ ایسے میں ہزارہ کے مسلمان قبائل نے بہت بڑا اور ناماندہ جہرگہ بلایا اور علاقے میں پہلی شرعی حکومت قائم کرنے پر اتفاق ہو گیا۔ اس وقت بھی لوگوں کی نظر حضرت پیر بابا کے نامور جانشین سید اکبر شاہ ترمذی آف ستخانہ پر پڑی، انہوں نے اتفاق رائے سے انہیں علاقے کا بادشاہ اور امیر شریعت منتخب کر لیا۔ اسی جہرگے میں نواب خان تنولی رئیس شنگڑھی اور غلام خان ترین رئیس درویش کو وزیر اور سیف اللہ خان رسالدار کو میر منشی مقرر کیا گیا۔ یہ اس علاقے میں پہلی اسلامی اور جمہوری حکومت تھی۔ انگریز کی آمد (۱۸۴۹ء) تک یہ حضرات ہی علاقے کا نظم و نسق چلانے رہے۔ تاہم یہ صورت حال چونکہ حقوڑے ہی عرصہ تک قائم رہ سکی اس لئے مقامی لوگ اس دور کو "لنڈے مسلمان" یا "مختصر عرصہ کی اسلامی حکومت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سادات ستخانہ کے اس خاندانہ کی تاریخ عزم و شجاعت کی تاریخ ہے، مدتوں تک ستخانہ جنگ آزادی کا بہت بڑا مرکز رہا اور انگریز اپنی تمام قوت اور وسائل کے باوجود سید اکبر شاہ ترمذی اور مجاہدین ستخانہ کے نام سے لڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دنوں میں بھی فرنگی کی افواج کے ہندوستانی سپاہیوں نے کسی جگہ کو اپنا مرکز بنایا تو وہ ستھانہ ہی تھا۔ البتہ مجاہدینِ آزادی کی بدقسمتی اور انگریز کی خوش قسمتی سے سید اکبر شاہ بادشاہ کا انتقال عین اسی دن ہوا جب میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے فرنگی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا چنانچہ ان کی وفات پر پشاور کے انگریز کمشنر سر ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا کہ

” اس وقت اگر مجاہدوں کا سربراہ اکبر شاہ زندہ ہوتا تو صورت حال کچھ اور ہوتی۔“

یہی نہیں کہ سید اکبر شاہ ترمذی کو ہزارہ کے قبائل نے متفقہ طور پر اپنا بادشاہ چنا بلکہ جب بعد میں سوات بونیر اور نواحی علاقوں میں بھی سیاسی صورت حال ابتر ہوئی اور مختلف سرحدی قبائل آپس ہی میں مشقت و گریبان رہنے لگے تب بھی ستھانہ کے سادات ترمذی کا یہی گھرانہ کام آیا۔ ان دنوں اخون صاحب سوات حضرت عبدالغفور بابا ان علاقوں کے روحانی تاجدار تھے، تمام لوگ ان کے فیصلے پر تسلیم خم کیا کرتے تھے۔ اخون صاحب نے ان تمام علاقوں کے قبیلوں کا ایک نمائندہ جوگہ بلایا، چونکہ وہ خود دنیوی جاہ و جلال کو پس نہ کرتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی طرف سے سید اکبر شاہ ترمذی کا نام نامی علاقے کے بادشاہ کے طور پر تجویز کیا۔ تمام قبائلی سرداروں اور نمائندوں نے اخون صاحب سے اتفاق کیا اور سید اکبر شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۴۷ء کا ہے۔ سید اکبر شاہ ترمذی قابلیت اور شجاعت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، جمعیت مجاہدین کے پانچ سو سے زیادہ سرفروش ان کے ادنیٰ اشارے پر جان تک کا نذرانہ پیش کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنا ایک رسالہ تیار کیا، جہاں بھی کوئی گڑبڑ ہوتی یہ سوازیجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں پہنچ جانے اور غلط کاروں کو سزا دینے۔ اس طرح سید اکبر شاہ بادشاہ کی کوشش سے سارے علاقے میں امن و امان قائم ہو گیا۔ وہ اپنی وفات (۱۸۵۷ء) تک سوات اور بونیر کی بادشاہت کے منصب پر فائز رہے۔

ان کے بعد ان کے بیٹے سید مبارک شاہ اور پوتے سید فیروز شاہ نے بھی سیاسیات  
سرحد میں نمایاں کردار انجام دیا۔

ستھانہ اور سادات ستھانہ کے بارے میں مولانا غلام رسول مہراپنی کتاب "سرگزشت  
مجاہدین" میں لکھتے ہیں۔

" اٹھارویں صدی عیسوی میں سید ضامن شام نے اس گاؤں کو آباد کیا۔ چونکہ  
سادات کا یہ گھرانا بڑی عزت و احترام کا مالک تھا، اس لئے گاؤں کو "آستانہ"  
یا "آستانہ سادات" کہا جاتا تھا، جو بگڑ کر ستھانہ بن گیا۔ ستھانہ کا اصل قصبہ  
دریائے سندھ کے کنارے تھا۔ لیکن ۱۸۴۱ء میں دریائے سندھ میں خوفناک سیلاب  
آیا جس سے قدیم ستھانہ برباد ہو گیا۔ موجودہ ستھانہ دریائے سندھ سے کافی دور بنا گیا  
قاضی میر عالم آف سکندر پور ہزارہ (جو انگریزوں کی عطا کردہ آری کے ابتدائی دور میں اسٹنٹ  
کشنر تھے) ایک خط میں جسے "تاریخ ہزارہ" کے مولف ڈاکٹر شیر بہادر خان نے نقل کیا ہے کہ  
" سادات ستھانہ قریبی سید ہیں اور بونیر کے پیر بابا علیہ الرحمۃ کی اولاد  
ہیں۔ یہ لوگ آج کل منگل پٹانہ، تختہ بند وغیرہ علاقہ غیر (آزاد قبائل) میں آباد  
ہیں۔ تاہم ان کی ایک شاخ صوابی، میرا اور گندف میں بھی سکونت پذیر ہے  
سادات ستھانہ کی شہرت سید اکبر شاہ کے زمانے میں انتہائی عروج کو پہنچی  
ہوئی تھی۔"

ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے سادات ستھانہ کے بارے میں، ۱۷ اپریل ۱۸۶۸ء کو لکھا کہ  
" بہت سال ہوتے سرکار انگریزی کی سرحد کے قریب سادات کے چند گھرانوں  
نے، جن کے گرد پنجاب، سرحد اور پٹنہ بہار کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے  
ستھانہ کی بنیاد رکھی۔ ان کی کل تعداد پانچ سو کے قریب تھی۔ یہ گاؤں سرکار  
انگریزی کے خلاف "نقنہ انگریزی" (جہاد) کا مرکز تھا اور سرکار انگریزی کے

کے علاقہ کے "جرائم پیشہ" اور دوسرے لوگوں کے لئے جائے پناہ!  
سید اکبر ان کا سرغنہ تھا جو بعد میں سوات کا بادشاہ بنا اور اوائل ۱۸۵۷ء  
میں فوت ہو گیا۔

صوبہ سرحد کا ایک سابق انگریز گورنر سر اولف کیرو اپنی کتاب "پٹھان" میں سید اکبر شاہ  
بادشاہ کے بارے میں رقم طراز ہے کہ۔

"سید اکبر سکھوں کے خلاف یوسف زئی لڑاکوں کا قائد تھا یہ معرکہ نوشہرہ  
کے قریب دریائے کابل کے بائیں کنارے پیرساک کے مقام پر ۱۸۲۴ء میں  
ہوا، سکھوں کے دور میں سید اکبر نے بڑی شہرت اور طاقت پائی۔ ہزاروں سے  
جو خوانین یا دوسرے لوگ سکھوں (اور انگریزوں) سے بھاگ کر ستخانہ  
پہنچے وہ ان کو پناہ دیتا تھا۔ وہ علاقے کی پٹھان اقوام آما زئی۔ مداحیل  
اتمان زئی اور گدون کا پیر تھا۔ یہ لوگ اس کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ اس  
وجہ سے وہ نواب آف امب (پانڈہ خان تنولی) کا حریف بھی تھا۔ وہ نواب  
کے مقابلے میں ہندوستانی مجاہدین کی پیٹھ ٹھونکتا اور نواب امب کے علاقہ  
کو نقصان پہنچاتا۔"

سید اکبر شاہ فرنگی حکومت کا مخالف اور دشمن تھا، ہندوستانی مجاہدین کی  
کافی جمعیت ہر وقت اس کے ساتھ رہتی اور وہ سرکاری علاقے میں ادا تیں کرتے  
یہ سید اکبر شاہ ہی تھے جنہوں نے اپنے مجاہدوں اور یوسف زئی غازیوں کی ایک جمعیت  
کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوری فوج کا مقابلہ کیا اور اسے لوہے کے چنے چھوٹانے  
اگر اس موقع پر کابلی سردار یار محمد خان اور محمد عظیم خان بھٹوڑی سی بھی ہمت کرتے تو سکھ  
کبھی صوبہ سرحد کی سرزمین پر قدم نہ رکھ سکتے۔ لیکن عین موقع پر یار محمد خان نے فرار ہو کر  
ہشت نگر میں پناہ لے لی اور سردار محمد عظیم خان اپنے سارے لادشکر کے ساتھ چمکنی

ہی میں مقیم رہا اور آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

پیرسبک کے اس معرکہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب پشاور کے کابلی گورنر یار محمد خان نے اندر ہی اندر سکھ راجہ رنجیت سنگھ سے صلح کر لی اور اس کا باج گزار بننا قبول کر لیا تو کابل کے سردار محمد عظیم خان کو بڑا طیش آیا اور وہ سکھوں سے دو دو ہاتھ کرتے کی غرض سے اپنے لاؤشکر کو لے کر پشاور آیا۔ اس کی آمد کا سنتے ہی یار محمد خان ہشت نگر بھاگ گیا تا کہ عظیم خان کے غضب کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ عظیم خان خود تو چمکنی میں ٹھہرا رہا لیکن اپنے بھتیجے محمد زمان خان اور خشک سردار فیروز خان کے بیٹے صدیق خان کو فوج دے کر نوشہرہ بھیجا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس وقت اٹک میں مقیم تھا۔ ۱۳ مارچ ۱۸۲۴ء کو اس نے دریائے سندھ کو پار کیا اور ۴ مارچ کو اکوڑہ خشک کے قریب خیمہ زن ہو گیا اس ایشیا میں سید اکبر شاہ ترمذی نے سارے علاقہ یوسف زئی کا دورہ کر کے غازیوں کو پیرسبک کی پہاڑیوں پر جمع کر رکھا تھا۔ سکھ فوج کی تعداد چوبیس ہزار تھی اسے رسالے اور توپ خانے کی مدد بھی حاصل تھی، اس کے مقابلے میں مسلمان غازی ایک ہزار سے زیادہ نہ تھے۔ سکھ حکمران نے سب سے پہلے اپنے مشہور سردار فرخشاہ کالی پھولا سنگھ کو طوفانی دستے کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف بھیجا لیکن سید اکبر شاہ کی کمان میں غازی اس جوش سے لڑے کہ کالی پھولا سنگھ اور اس کے تین ساتھی افسر غریب سنگھ، کرم سنگھ اور چھپول کو دیکھتے ہی دیکھتے ہلاک کر دیا، سکھ فوج کے فرنگی افسر بھی معرکہ میں کام آئے۔ صبح سے شام تک مسلمان مجاہد گاجر مولیٰ کی طرح دشمن کے سپاہیوں کو کاٹتے رہے۔ سردار چارلس ویڈ کے بیان کے مطابق سکھوں کے دو ہزار سپاہی اس معرکہ میں مارے گئے، اس سے زیادہ نقصان سکھ فوج کو کبھی اٹھانا نہ پڑا تھا۔ یہ حال دیکھ کر خود مہاراجہ رنجیت سنگھ ہاتھی پر آگے بڑھا گورکھا پلٹنیں اس کے ساتھ تھیں۔ سید اکبر شاہ اور غازی اس شان سے لڑے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ اندھیرا ہوا تو ہر مجاہد یا تو لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کر چکا تھا اور یا زخمی ہو کر رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔



مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فتح کی اتنی خوشی نہ تھی جتنی اکالی پھولا سنگھ جیسے جان نثاروں کی موت کا صدمہ تھا، اس نے کئی دن تک مرنے والوں کا سوگ منایا۔ اکالی پھولا سنگھ کی سادہ وہی بنوائی اور اس کے ساتھ پیرسبک کی ہزاروں ایکڑ اراضی وقف کر دی۔

سید اکبر شاہ اور مسلمان غازیوں کے ہٹتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لئے فتح پشاور کا دروازہ کھل گیا — وہ پانچ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور ۱۸۲۴ء کو فتح کے شادمانے بجاتا ہوا پشاور میں داخل ہو گیا۔

جہاں سید اکبر شاہ اور مسلمان غازیوں نے دین کے نام پر اپنا خون نثار کیا اور جانوں کا نذرانہ پیش کیا وہیں ہوس اقتدار کے مارے کاہلی سرداروں کی غیرت میں کوئی جوش نہ آیا اور انہوں نے سکھ مہاراجہ کا باج گزار بننا قبول کر لیا۔

سید عبدالجبار شاہ بھی ساداتِ ستھان کے خاندان کے ایک نامور فرد تھے، علم و فضل میں

### سید عبدالجبار شاہ ترمذی

صاحبِ کمال ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے سیاست دان اور صاحبِ شمشیر و علم بھی تھے۔ ۱۸۹۷ء میں انگریزوں نے مالکنڈ اور سوات پر لشکر کشی کی تو لنڈا کی کے مقام پر ان کے خلاف کھل کر اڑھتیا دیتے رہے، ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے، بے حد وجیہ اور بارعب انسان تھے، سیادت و امارت انہیں ورثے میں ملی تھی، بڑے خوش گفتار اور وسیع المطالعہ انسان تھے، تحقیق و جستجو کا ذوق تھا، انہوں نے اپنے جدِ امجد حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے حالات اور صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے تاریخ و واقعات پر مبنی ضخیم کتاب ”عبرۃ اولی الابصار“ تحریر کی، لانا غلام رسول مہرنے اس کا قلمی نسخہ دیکھ کر بہت پسند فرمایا — انہوں نے لکھا کہ میرے محدود علم کے مطابق تاریخ سرحد اور تاریخ آزاد قبائل کے اتنے مفصل اور جامع حالات شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکیں۔

اگست ۱۸۹۸ء میں نواب محمد اکرم خان آف امب نے سید عبدالجبار شاہ کو اپنے ہاں بلایا جہاں وہ ۱۹۰۷ء تک وزیر مختار بھی رہے اور ریاست کے ولی عہد خانیزمان کے اتالیق کے طور پر

بھی فراتقض انجام دیتے رہے۔

جنوری ۱۹۱۲ء سے ستمبر ۱۹۱۵ء تک سید عبدالجبار شاہ سوات، بونیر اور نواحی علاقوں کے بادشاہ بھی رہے۔ وہاں سے دوبارہ امب چلے آئے اور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۶ء تک وہاں وزارت کے عہدہ پر فائز رہے۔

صوبہ سرحد اور افغانستان کے لوگ پر بابا سید علی غواص ترمذی علیہ الرحمۃ کے گھرانے کی اتنی عزت و تکریم کرتے تھے جس کا اندازہ بھی آج کل کے اس مادہ پرستی کے دور میں نہیں کیا جاسکتا، امیرانِ کابل اس بات کو اپنے لئے فخر سمجھتے تھے کہ اپنی بیٹیاں کونرٹ کے اس نامور سید گھرانے میں بیاہ دیں۔ دوسرے سرکردہ رئیس اور سردار بھی اس گھرانے کی رشتہ داری کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ سید عبدالجبار شاہ نے محلی شادیاں نہایت اونچے گھرانوں میں کیں۔

اتفاق سے بخارا کے ولی عہد شہزادہ سید عبدالملک کو حالات سے مجبور ہو کر ملک چھوڑنا پڑا تو وہ پہلے امیر کابل شیر علی خان کے پاس ٹھہرے۔ امیر نے اپنی بھتیجی سے ان کی شادی کرادی۔ یہ شہزادی اس سے قبل امیر شیر علی خان کے فرزند ولی عہد عبداللہ جان سے منسوب تھی جو عالم شباب میں فوت ہو گئے تھے۔ بعد میں شہزادہ بخارا ایبٹ آباد آ گئے، حکومت نے ان کی قدر افزائی کے طور وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ وہ انتہائی دیندار، وسیع المطالعہ اور عالم فاضل انسان تھے، بڑی پُر وقار اور بارعیب شخصیت کے مالک تھے۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد وہ سید عبدالجبار شاہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی صاحبزادی رجان کی خاندانی بہیم کے بطن سے تھی، ان کے نکاح میں دے دی۔ بخارا کے یہ ولی عہد شہزادہ نومبر ۱۹۰۹ء تک زندہ رہے، وہ سید عبدالجبار شاہ کی بے حد عزت و تکریم کرنے لگے اور ان کے علم و فضل اور خاندانی وجاہت کے انتہائی قدردان تھے۔

## سید جمال الدین افغانی

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے خانوادے کے لئے  
یہ فخر ہی کچھ کم نہیں کہ عالم اسلام کے عظیم بطل

جلیل، شہرہ آفاق مسلمان مفکر، علمبردار اتحاد بین المسلمین، عظیم قائد اور داعی انقلاب سید  
جمال الدین افغانیؒ اسی ترمذی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مؤرخوں نے ان کی جائے ولادت  
سعد آباد لکھی ہے، تاہم اصل میں یہ کونڑ کا مقام سید آباد ہے۔ ان کے اپنے بیان کے  
مطابق وہ ۱۲۵۴ ہجری (۱۸۳۸ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے ہی گھرانے کے  
بزرگوں سے حاصل کی، بعد میں مروجہ علوم کی تکمیل کے لئے کابل گئے۔ انہیں فلسفہ اور علوم  
طبیعی سے خاص مناسبت تھی۔ کچھ عرصہ انہوں نے ہندوستان میں رہ کر جدید تعلیم حاصل کی  
یہیں سے وہ حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز دن  
تھے۔ وہ اہل ہند کے جذبہ حریت سے خالص متاثر ہوئے۔

فریضہ حج ادا کرنے کے بعد وہ ہخنانستان پہنچے تو امیر دوست محمد خان نے ان کی  
بڑی قدر و منزلت کی اور اپنا وزیر مقرر کیا۔ تاہم افغانستان کی آئے دن کی خانہ جنگیوں سے  
تنگ آکر انہوں نے ملک چھوڑ دینے ہی میں مصممت سمجھی۔ وہ ہندوستان چلے آئے اور یہاں  
کے شاہیر سے ملاقاتیں کیں، اس دوران انگریزی حکومت ان کی کڑی نگرانی کرتی رہی اس  
پر وہ دوبارہ حج کے ارادے سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں وہ قاہرہ پہنچے جہاں  
جامعہ ازہر کے علماء آپ سے بڑے متاثر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں وہ ترکی چلے گئے جہاں انہیں  
محکمہ تعلیم کی جانب سے مسجد ابا صوفیہ اور مسجد احمد میں خطبہ دینے کی دعوت دی گئی۔ ان  
کی غیر معمولی شہرت اور ہر و لعزیزی کے پیش نظر ترکی کے علماء کا ایک طبقہ ان سے حسد  
کرنے لگا۔

سید جمال الدین افغانی کے پیش نظر دو مقاصد جلید تھے۔ اولاً مسلمان عوام کو اغیار کی  
غلامی سے نجات دلانا اور دوم اتحاد عالم اسلامی کا حصول۔ ماہج ۱۸۷۱ء میں وہ مصر پہنچے

اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کام کرنے لگے۔ مصری نوجوان حقوق درجوں ان کے حلقہ اثر میں آتے گئے۔ اپنے انقلابی خیالات کی اشاعت کے لئے انہوں نے ایک روزنامہ قاہرہ سے جاری کیا۔ ان دنوں برطانیہ کو مصر میں بڑا اثر و نفوذ حاصل تھا۔ برطانوی شہنشاہیت سید جمال الدین افغانی کے جذبہ جہاد سے بڑی فائدہ ہتی۔ چنانچہ ان کے ایما پر حکومت مصر نے ستمبر ۱۸۷۹ء کو انہیں ملک بدر کرا دیا۔ اس پر سید جمال الدین افغانی ایک بار پھر ہندوستان چلے آئے۔ اپنے قیام حیدرآباد کے دوران انہوں نے دہریوں کے بطلان میں ایک فارسی رسالہ لکھا جس کا ترجمہ عربی میں مصر کے مفتی محمد عبدالعزیز نے بھی کیا۔ اس رسالے میں انہوں نے ڈیڑھ دن کے نام نہاد فلسفے کی دھجیاں اڑا دیں اور ثابت کیا کہ فقط مذہب اور بالخصوص اسلام ہی انسانی معاشرے کے استحکام اور سلامتی اور قوموں کی ترقی کی ضمانت دے سکتا ہے جب کہ لادینی مادیت انحطاط اور زوال کا سبب ہے، انہوں نے بتایا کہ قرآن کی رو سے انسان اشرف المخلوقات ہے اور بہترین امت، امت مسلمہ ہے۔

سید جمال الدین افغانی کورات دن نقطہ ہی دھن بختی کہ مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے کو قرون اولیٰ کے اسلامی انقلاب سے روشناس کریں، اس غرض سے وہ یورپ کے مادی نظریات کے خلاف مصروف جہاد رہے، کبھی برطانیہ جاتے کبھی امریکہ۔ وہ جگہ جگہ لیچر دیتے انہوں نے ثابت کیا کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام اور صرف اسلام ہی کی تعلیمات میں تمام انسانی مسائل کا حل موجود ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام اور سائنس میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ماضی میں مسلمان قومیں بڑے بڑے نامور سائنس دان گزے ہیں۔

اہل یورپ کے ملحدانہ نظریات کا رد کرنے کے لئے انہوں نے اپنے نامور شاگرد محمد عبده کے ساتھ مل کر پیرس سے "عروة الوثقی" کے نام سے اخبار جاری کیا۔ اس جریدہ میں دوسرے امور کے علاوہ اسلامی ملکوں میں فرنگی کی کارستانیوں اور حکمت عملی کو بھی بے نقاب کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگایا۔ انہیں اپنے شاندار

اور عظیم ماضی سے روشناس کرایا۔ انہوں نے فروعات کی بجائے اسلام کے ان تیز اصولوں کی تبلیغ کی جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان دوبارہ اپنی کھوتی ہوئی قوت اور شوکت حاصل کر سکتے ہیں انہوں نے جہاں دشمنان اسلام کی خبر لی۔ وہیں ان مسلمان حکومتوں اور حکمرانوں پر بھی شدید نکتہ چینی کی جو یورپی حکومتوں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ ان کی کوششوں کی بدولت ایران، مصر اور ترکیہ میں سچی اسلامی بیداری پیدا ہوئی۔ لوگ مطلق العنانیت کو ناپسند کرنے لگے اور جمہور کی سر بلندی اور فلاح و بہبود کو اپنی منزل مقصود سمجھنے لگے۔

سید جمال الدین افغانی وہ مردِ قلندر تھے جو مصلحتوں کی بجائے صرف حقائق پر نظر رکھتے تھے حکومتیں انہیں ہر قیمت پر خریدنا چاہتی تھیں لیکن وہ تو حضرت پیر بابا کے مشن پر چلتے ہوئے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کام کیا کرتے تھے۔ اس راہ میں انہیں مشکلات کے پہاڑوں سے ٹکرانا پڑا اور مخالفت کے طوفانوں سے گزرنا پڑا لیکن اللہ کا یہ نیک بندہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہا۔

اتحاد عالم اسلامی کے اس سب سے بڑے علمبردار کے آفری ایام بڑے کٹھن گزرنے، ترکی کے خود پرست حکمران کے ہویہ کی وجہ سے وہ قیدی کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ ان پر بناوت کا الزام عائد کیا گیا، کبھی انہیں سازشوں میں ملوث قرار دیا گیا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۹۶ء کو جب شاہ ایران کو افغانی کے ایک وفادار پیروکار نے قتل کر دیا تو ان پر پابندیاں اور بھی سخت کر دی گئیں۔ بالآخر طویل بیماری اور سہمی کے عالم میں سید جمال الدین افغانی ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو وراثت پا گئے۔ انہیں ترکی ہی میں دفن کیا گیا تاہم ۱۹۲۲ء میں ان کے ہم وطنوں کے اصرار پر ان کی نعش پشاور اور پھر وہاں سے کابل لے جاتی گئی جہاں ۲ جنوری ۱۹۲۵ء کو دوبارہ انہیں کابل کے مضافات میں علی آباد کے قریب دفن کیا گیا اور ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

سید جمال الدین افغانی مشرقِ جدید کی تاریخ میں آزادی ایشیا کے پہلے مجاہد تھے حکیم الامت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمۃ نے انہیں زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا موسس قرار دیا ہے

پچھلی صدی عیسوی کے سبھی مسلمان زعماء سید جمال الدین افغانی کی ذات اور افکار سے انتہائی متاثر تھے، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، علامہ عنایت اللہ خان المشرقی اور مولانا ابوالکلام آزاد سبھی نے ان کی عظمتِ فکر کا دلی اعتراف کیا ہے، حقیقت یہی ہے کہ سید جمال الدین افغانی کے پائے کا کوئی مسلمان رہنما سائے نچتو نچواہ میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اقبال انہیں فرجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سید السادات مولانا جمال

زندہ از گفتار او سنگ و سفال

سید جمال الدین افغانی نے اپنے جدِ امجد حضرت پیر بابا بونیری کی مانند عمر بھر اپنے عہد کی دھڑت اور اس کے اثرات کو مٹانے کے لئے کوشاں رہے۔ انہوں نے مغرب کے لادینی خیالات و افکار کے خلاف نہ صرف قلمی جہاد کیا بلکہ اپنی پوری زندگی کو واڈ پر لگا دیا۔ وہ پہلے مسلمان فلاسفر تھے جنہوں نے ڈاروینیت اور مارکسیت کا حل سائنٹفک انداز میں کیا اور دینِ اسلام کی حقانیت کو واضح کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایسا دین ہے جو دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کر سکتا ہے۔

انٹار عالمِ اسلامی کا حصول ان کا نصب العین تھا۔ وہ مسلمانوں کو خلافتِ اسلامیہ کے چھینٹے تلے متحد اور منظم کرنا چاہتے تھے، چنانچہ "العروة الوثقی" میں وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "مسلمان کبھی ایک پر جلال سلطنت کے ماتحت متحد تھے۔ چنانچہ فلسفہ اور علم و فضل میں ان کے کارنامے آج تک تمام مسلمانانِ عالم کے لئے باعثِ فخر ہیں۔" تاہم مغربی اقوام نہ صرف ان کی سیاسی آزادی کو سلب کرتی ہیں۔ بلکہ ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت کو کمر خیال کر کے مغربی افکار کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی قدروں کی قدر کریں اور اپنی ثقافت اور تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں۔ یہ جمال الدین افغانی ہی تھے جنہوں نے اہل مشرق کو بتایا کہ جن لوگوں کی اپنی زبان نہ ہو

ان میں قومیت کا صحیح تصور پیدا نہیں ہو سکتا اور جس قوم کا اپنا ادبی سرمایہ نہ ہو اس کی زبان بھی نہیں ہوتی۔ نیز جس قوم کی اپنی تاریخ نہیں، اس کی دنیا میں کوئی عزت نہیں ہو سکتی اور جو لوگ اپنے قومی ورثہ کو حاصل نہیں کر سکتے یا اپنے بزرگوں کے کارناموں کی قدر نہیں کر سکتے ان کی کوئی تاریخ نہیں ہو سکتی۔

سید جمال الدین افغانی ترمذی کی زندگی ایک معلم، مبلغ اور مصلح کی زندگی تھی۔ ان کا نصب العین مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ کی باز آفرینی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ غلبہٴ اسلام کا عظیم مقصد ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی آنکھ سے اوجھل ہونے نہیں پاتا تھا، اس مقصد سے انہیں اتنا اہمک تھا کہ انہوں نے ساری زندگی بجز روانہ اور قلندرانہ گزار دی۔ وہ بلاشبہ حضرت پیر بابا سید علی خواص ترمذی علیہ الرحمۃ کی لڑی کے ایک نہایت ہی نایاب اور اہم موقی تھے۔ امت مسلمہ ان کے احسانات کو ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکتی۔

یہ سید جمال الدین افغانی ہی کی تبلیغات، ہرشد و ہدایت اور کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان عوام میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی۔ ان کے دل میں شمع آزادی روشن ہوئی۔ وہ فرنگی استعمار اور استبداد کو ختم کرنے پر اٹھ کھڑے ہوئے، ہر جگہ آزادی کی تحریکوں نے سراٹھایا اور ایک ایک کر کے انہوں نے غلامی کا بوا اپنی گزروں سے اتار پھینکا۔ آج بفضلِ خدا چاروں طرف کے قریب آزاد مسلمان ممالک دنیا کے نقشے پر موجود ہیں۔ کبھی وہ اسلامی سربراہ کانفرنس میں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور کبھی مؤتمرِ عالمِ اسلامی کے پلیٹ فارم پر جمع ہوتے ہیں، دیکھا جائے تو اس بیداریِ امت کا اصل سہرا سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمۃ ہی کے سر ہے۔

حضرت سید علی خواص ترمذی عرف پیر بابا علیہ الرحمۃ کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے بڑا شرف بخشا۔ تفصیل

حضرت پیر بابا کے جانشین

دوسری جگہ مذکور ہے، ان کی اولاد میں پشت در پشت کامل اور صالح انسان پیدا ہوئے جن کی تبلیغی اور تعلیمی کاوشوں سے سائے صدیوں اور افغانستان کے مسلمان مستفیض ہوئے

اور ہر طرف اسلام کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔

ان کے روحانی سلسلے کی حالیہ مشہور شخصیت حضرت سید پائندہ شاہ المعروف چڑائی بابا گزسے ہیں، وہ علاقہ غوربند ضلع سوات میں ۱۲۶۳ ہجری کو تولد ہوئے یہ وہ علاقہ ہے جو برفانی تو دوں اور گلیشیروں سے اُٹا پڑا ہے۔ راستے بڑے کٹھن ہیں۔ اس دوران مادہ حنظلہ میں اسلام کی روشنی پھیلانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے چڑائی میں مسجد، دینی مدرسے اور منگر کا سلسلہ قائم کیا، وہ مسافروں، ناداروں اور مسکینوں کی فراخ دلانہ مدد کرتے۔ علاقے کے لوگوں کے تنازعات ختم کراتے اور فضول رسم و رواج کا خاتمہ کرنے میں کوشاں رہتے۔ یہ اعزاز بھی انہی کے حصے میں آیا کہ انہوں نے والی سوات میاں گل شہزادہ عبدالوہود کی اجازت سے مزار پیر بابا سے پیوست ایک رفیع الشان جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہ خانہ خدا رفیق تعمیر کا ایک خوبصورت نقش ہے جس سے بہتر مسجد سارے علاقہ میں موجود نہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت چڑائی بابا کو خواب میں حضرت خواجہ پیر بابا علیہ الرحمۃ کی طرف سے اس مسجد کی تعمیر کی ہدایت ہوئی تھی چنانچہ انہوں نے وہ خواب پورا کر دکھایا۔ حضرت چڑائی بابا نے ۱۱ رجب ۱۳۶۸ھ کو وفات پائی۔ ان کا مقبرہ اپنے جد امجد حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے مرقد پر انوار مسجد پیر بابا کے ملحق ہے۔ ارادت مند وہاں عقیدت و احترام سے حاضر فرماتے ہیں۔

سال ۱۹۸۶ء تک حضرت چڑائی بابا کے فرزند ارجمند سید معین الدین شاہ صاحب ترمذی سجادہ نشین تھے جنہوں نے مزار پیر بابا کے پاس ہی ایک دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی جہاں سارے سوات، غوربند، کوہستان اور دوسرے علاقوں کے طالب علموں کو نہ صرف قرآن و حدیث اور مروجہ علوم اسلامی کی تعلیم مفت دی جاتی ہے بلکہ انہیں خورد و نوش اور قیام و طعام کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ درس گاہ یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو قائم ہوئی اور آج تک یہاں مشہور علمائے دین طلباء کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں رات دن مصروف ہیں۔



بعض حلقے اپنی مخصوص اغراض کے پیش نظر  
 یا ناواقفیت کی بنا پر طریقِ خالقِ ہی اور

## جہادِ آزادی اور صوفیائے کرام

نظامِ طریقت پر معترض ہوتے ہیں، وہ تصوف کو گوشہ نشینی، رہبانیت اور جہادِ زندگی سے فرار کے فرضی معانی پہناتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ تصوف تو بیداری اور جدوجہد کا درس لئے ہوتے ہے۔ صوفیائے کرام تو ایک دقیقہ بھی ضائع نہیں کرتے بلکہ اپنے جسم اور روح کو ہمہ وقت اور ہمہ تن اپنے مولائے حقیقی کی عبادت اور بندگانِ خدا کی خدمت کے لئے وقف کئے رہتے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، صرف صوبہ سرحد ہی کی تاریخ کا مطالعہ اس سلسلے میں حقیقت حال کا شاہد ہے۔ یہ اللہ کے ہی تھے جنہوں نے اکبری اتحاد کے خلاف نعرہٴ جہاد بلند کیا۔ یہ صوفیائے کرام ہی تھے جنہوں نے سکھوں اور فرنگیوں کے خلاف لوگوں کو منظم اور صفِ آرا کر کیا اور یہ سجادہ نشین اور پیرانِ طریقت ہی تھے جنہوں نے کسی بڑی سے بڑی کافر طاقت کے قدم صوبہ سرحد کی سرزمین پر چمنے نہ دیئے جب کبھی دینِ اسلام پر کڑا وقت آیا۔ یہ حضرات کرام اپنے حجروں کے نکلے اور میدانِ جہاد میں غازیوں کے شکروں کی کمان کرنے لگے۔ حضرت اخون صاحب سوات، حضرت نجم الدین پڑھ ملا، فقیر صاحب انگر، حاجی صاحب ترنگ زئی، شہزادہ فضل دین، سر تور فقیر اور بیسیوں ایسے حضرات کے نام شمار کئے جاسکتے تھے۔ جنہوں نے فرنگی کی توپ و تفنگ اور لاؤشکر کا مقابلہ خالی ہاتھوں محض خدائی طاقت اور قوتِ ایمان سے کیا۔ ان حضرات نے جابر حکمرانوں کے منہ پر کلمہ حق کہنے کی سنت ادا کی۔ انہوں نے انتہائی بے غرضی اور اخلاص سے لوگوں میں اللہ اور اللہ کے رسول و صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر سرکٹنے اور جان دینے کا جذبہ پیدا کیا۔ ان حضرات ہی کی بدولت لوگوں نے اسلامی سادگی کا طریق اپنایا اور تقویٰ و طہارت کے پانی سے دلوں کو پاک کیا۔ ظاہری تعلیم صرف انسان کے ظاہر کو سنوارتی ہے جب کہ طریقت کی تعلیم و تربیت سے نفوس کا تزکیہ ہوتا رہا۔ دل پاک ہوئے اور دل بے

تو دنیا بدل گئی۔ انکار و اعمال میں انقلاب آگیا۔ لہبتیت مقصد و مقصود بن گئی۔ ان حضرات کے نفس گرم نے دلوں کو حرارت اور سینوں کو نور بخشا، ان نفوس قدسیہ نے انسان کو صرف اور صرف اللہ کی چوکھٹ پر جھکنا سکھایا اور غیر اللہ کا ڈر دل سے نکال دیا۔ صوبہ سرحد کے ان پاک باطن صوفیائے کرام کی مجاہدانہ زندگی کا مطالعہ ذہنوں کو جلا اور دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرور بخشا ہے گا۔

حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا  
 حضرت پیر بابا کا عظیم کارنامہ  
 علیہ الرحمۃ کا سب سے بڑا دینی کارنامہ ہے

کہ انہوں نے سرزمین یوسف زئی بالخصوص کوہستانی علاقوں میں اصلاح عقائد کی ہم کامیابی سے چلائی، عوام کو اسلام کے بنیادی ارکان سے آشنا کیا اور نام نہاد اور خود ساختہ پیروں اور پیشواؤں کی بیخ کنی کی۔ اس سلسلے میں ایک تو پیر بابا کو اپنے مرشد کی جانب سے ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان دور افتاد علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا فریضہ انجام دیں، دوسرے اپنی باطنی بصیرت اور معرفت کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلامیات ہند کی تاریخ میں پختون قوم نے اور پختون قوم کی تاریخ میں یوسف زئی قبائل کا کردار بڑا قابل فخر رہا ہے، اس لئے اگر یوسف زئی مائل بہ اصلاح ہو گئے تو ان کے اثر و نفوذ اور عظیم صلاحیتوں کی بنا پر اسلام کی قوت میں بہت اضافہ ہوگا اور سارے علاقوں میں دین حق کا بول بالا ہو جائے گا۔

یوسف زئی کی ان عظیم صلاحیتوں کا اعتراف خود حضرت پیر بابا ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”میں نے جب مختلف اقوام اور قبائل کو دیکھا تو یوسف زئی قبیلوں کو ایسی حالت میں پایا کہ وہ سب نہایت ہی سادہ دل (مخلص) اور دین کے گرویدہ

لے خودنوشت: سید عبدالجبار شاہ

تھے۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر ہر قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ ان کے جوان بوڑھوں سے بھی زیادہ دینداری میں استوار اور ان کی عورتیں مردوں سے بھی بڑھ کر دینی امور پر کاربند اور عمل پیرا تھیں۔ یہاں تک کہ ان کا بچہ بچہ دین کی طرف مائل تھا۔

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر یوسف زئی کی اسلامی خدمات کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ کچھ تو عوث بنو نیر و حضرت پیر باباؒ کی تعلیم و تربیت کا اثر معمولی اثر نہ تھا اور کچھ دین کی راہ میں جہاد کرنا اور ہر طرح کی قربانی دینا یوسف زئی قوم کے خمیر و فطرت میں داخل تھا۔ میدانی علاقوں کے لوگوں کی اصلاح احوال کے بعد حضرت پیر باباؒ کے خلفاء اور ارادت مندوں نے یوسف زئی مجاہدوں کے تعاون سے کوہستانی علاقوں کے لاکھوں لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔

اس ضمن میں حضرت پیر باباؒ کا کہنا ہے کہ

مہ تقویت اسلام کی خاطر ان قبیلوں میں سے کوئی بھی قبیلہ جہاد باسیف میں یوسف زئی سے بڑھ کر جان نثار نہیں نکلا۔ ان کی بے نظیر جرات اور جانبازی کی بدولت کوہستان کے کفار کا خاتمہ ممکن ہوا۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے بزرگ صوفیاء اور علماء بھی کام آئے یہاں تک کہ خود حضرت اخون درویشہ کا بیٹا بھی اس جہادِ سواست میں شہید ہوا۔ یوسف زئی قبائل کی اسلام دوستی کے اس واضح اعتراف کے ساتھ پیر باباؒ کی نظر ان خرابیوں پر بھی تھی جو ان دنوں صدی معاشرے میں سراپت کر چکی تھیں۔ پیر باباؒ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ خرابیاں اس لئے معاشرے میں دسائی ہیں کہ لوگ تعلیم سے بے بہرہ ہیں وہ دین کے احکام پر عمل کرنے کی بجائے جادو ٹونے اور مافوق الفطرت مظاہروں ہی کو اپنی نجات کا ضامن سمجھنے لگ گئے ہیں۔ انہوں نے اس دور کے مسلمان معاشرے کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ

..... لیکن سب کے سب اس مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے کہ ایک تو دینی تعلیم و تربیت کا نظام مفقود و معدوم تھا۔ جہالت کا دور دورہ تھا، نہ کوئی داعیہ تھا نہ عالم دین۔ علماء۔ اتقیا ناپید تھے اس پر مصیبت یہ کہ قریہ قریہ، قبیلہ قبیلہ کا پیر ہی ان کے لئے سب کچھ تھا۔ لیکن ان میں سے اکثر پیر جاہل، لحد اور بد عقیدہ تھے۔ انہوں نے اپنی اغراض و مقاصد کی خاطر لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا رکھا تھا اور لوگ اسلام کی حقیقی تعلیم سے بہت دور جا پڑے تھے۔

حضرت پیر باباؒ کو سرحدی عوام کی نفسیات کا بخوبی علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پختون فطرتاً مقلد واقع ہوئے ہیں۔ وہ دلیل کو ماننے اور کتابی تعلیمات کو سمجھنے کی بجائے زندہ شخصیت کے پیچھے چلنے والے ہیں، اس لئے جب بھی کسی پیر یا بزرگ کے آنے کا سنتے ہیں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے عقائد اور اعمال کی تحقیق کئے بغیر اس کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ اور یوں دین کے بنیادی ارکان پر چلنے کی بجائے توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت پیر باباؒ کا جہاد انہی "صونیائے خدام" اور جعلی پیروں کے خلاف تھا۔ وہ یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، صرف وہی پیر اور مرشد قابل احترام ہے جو شریعت محمدی پر پوری طرح کار بند ہو۔ حضرت پیر باباؒ اور علمائے حقانی کے نزدیک تصوف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کی جائے۔ اسوۂ رسولؐ و صحابہؓ کو دلیل راہ بنایا جائے۔ دین کے ادا مرد نو اہمی کی تعمیل کی جائے۔ طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے اور قلب کو اسوا کی نسبت اور تعلق سے پاک صاف رکھا جائے۔

حضرت پیر باباؒ کا مشن یہی تھا کہ اسلامی معاشرے کو اندرونی اور بیرونی فتنوں سے محفوظ بنایا جائے اور لوگوں کا تزکیہ باطن کر کے ایک پاکیزہ ماحول اور معاشرے کی تعمیر کی جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہدیہ کر لیا کہ راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کریں گے اور ہر ممکن ایثار اور قربانی

سے کام لیں گے۔ اپنے اس نصب العین کے حصول کے لئے حضرت پیر باباؒ اور ان کے ارادت مندوں نے ہر غلط کار کو لٹکارا۔ وہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گئے۔ انہوں نے ان نام نہاد "بزرگوں" سے مناظرے کئے۔ وعظ و ارشاد کی مجلسیں برپا کیں۔ سید عبد الجبار شاہ مرحوم نے تیس کے قریب ایسے "بد عقیدہ" پیروں کی تفصیل دی ہے جو پیر باباؒ کے دور میں پختون مسائشرے میں توہمات اور غیر اسلامی نظریات کے پرچار میں مصروف تھے۔ ان میں سے اکثر ان پڑھ اور جاہل تھے۔ وہ پیر باباؒ، اخون درویزہؒ اور ان کے عالم فاضل ساتھیوں کے دلائل کی تاب نہ لاسکے اور یا تو ان علاقوں سے کوچ کر گئے اور یا اپنے باطل عقائد سے تائب ہو گئے۔

ان مناظروں اور مقابلوں میں سب سے قابل ذکر وہ معرکے تھے جو حضرت پیر باباؒ بالخصوص ان کے مازون اخون درویزہ باباؒ اور پیر یازید انصاری اور اس کے پیروکاروں کے مابین دیکھے ہیں آج کل کے چند اہل قلم نے ان مذہبی مناظروں کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اسے "قومیت" کے جدید تناظروں کی روشنی میں پرکھ کر مختلف حاکمے قائم کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "قومیت" ہی موجودہ اصطلاح کو اس دور میں کوئی وقعت حاصل نہ تھی۔ پھر جہاں تک اسلامی قومیت کا تعلق ہے اس کی بنیاد ایمان پر ہے نہ کہ وطن و نسل پر۔ ابو جہل اور ابولہب قریشی ہوئے بھی اسلامی قومیت کے دائرے سے خارج ہے اس لئے کہ وہ غیر اسلامی عقائد کے علمبردار تھے اور بلال حبشیؓ اور سلمان فارسیؓ غیر عرب ہوتے ہوئے بھی مسلمان قوم کے لئے واجب التحظیم ہیں کہ وہ اسلامی عقائد و اعمال میں ہم سے ہم آہنگ ہیں۔ عقائد کا یہ اشتراک ہی اسلامی قومیت کی بنیاد ہے۔ ان حضرات کے نزدیک پیر باباؒ اپنی قرابت داری کی وجہ سے منگلوں کی طرف داری کرنے کے مترکب اور یازید انصاری منگلوں کی مخالفت کے باعث مقامی "ہیرو" قرار دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کا اختلاف محض عقائد کا اختلاف تھا۔ حضرت پیر باباؒ ایک مردِ خدا آگاہ تھے ان کی دوستی اللہ کے تھے اور عناد بھی محض اللہ کی خاطر۔ اگرچہ یازید نے مذہبی تحریک کو سیاسی تحریک میں بدلنے کی بڑی کوشش کی لیکن پیر باباؒ اس کے باوجود صرف یازید کے

مذہبی عقائد کو اختلاف کی بنیاد قرار دیتے رہے۔ تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہے کہ مغل شہنشاہوں سے حضرت پیر باباؒ کو کوئی جاگیر ملی ہو یا انہوں نے مغل دربار سے کوئی مراعات حاصل کی ہوں۔ ان کی اپنی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ یوسف زئی اور دوسری پنجتون اقوام کی صلاحیتوں کا کس قدر واشگاف الفاظ میں اعتراف کرتے رہے اور ان کی ساری عمر پنجتونوں کی خدمت میں گزری۔ انہوں نے ساری عمر فقر و فاقہ میں گزاری کوئی دنیوی منفعت یا غرض ان کے پیش نظر نہ رہی۔ پھر ”مفروضہ“ کیسے مان لیا جائے کہ وہ پنجتونوں کے ہی خواہ اور ہمدرد نہ تھے۔ اور اگر وہ پنجتونوں کے خیر خواہ نہ تھے تو پھر ان کا خیر خواہ اور کون ہو سکتا ہے؟

یہ بجا کہ پیر باباؒ کے ارادت مندوں اور بانی دیناری کے ساتھیوں میں اختلاف رائے موجود رہا۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف صفت آرا رہے، عین ممکن ہے کہ ان مناظروں اور مجادوں میں بات تلخ بیانی اور الزام تراشی تک بھی پہنچی ہو اور اس سلسلے میں فکری اور عملی مخالفتوں نے سراٹھایا ہو، ہم فریقین میں سے کسی بھی بے طرف داری کے حامی نہیں تاہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ہر بات کو زمان و مکان کے تقاضوں پر ہی پرکھا جانا چاہیے۔ آج سے چار سو سال پیشتر کا ماحول کچھ اور تھا۔ پھر عارفانِ الہی کا تو معاملہ ہی اور ہے۔ ان کے وارداتِ قلبی اور مشاہداتِ باطنی کو عام عقل اور مروجہ سیاسی معیاروں پر پرکھنا مناسب نہیں۔ صوفیائے کرام پر یہ اعتراضات اصل میں محض ظاہر بینی اور سطحی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی کتاب ”ہمعات“ میں اس ظاہر بینی اور ناقدانہ رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”ابابِ تصوف سے بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے

ارباب تصوف کے اقوال و احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے  
نپتے پھریں۔

اس طرح حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ اور بانی دین انصاری کے ارادت مندوں کے معرکوں  
اور مجادلوں کو فریقین کے مذہبی عقائد اور اسلامی نظریات ہی کی روشنی میں پرکھنا مناسب معلوم  
ہوتا ہے نہ کہ انہیں سیاسی حریت نامہ "قومیت" کے موجودہ مغربی معیار پر جانچنا۔ صوفیائے  
کرام ان دنیوی جھنجھٹوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مولوی اور صوفی میں فرق  
یہی ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو۔ اگر پیر بابا علیہ الرحمۃ سیاست یا حکومت  
سے دلچسپی رکھتے تو وہ یہ کام مغلیہ دربار اور مغلوں کی فوج میں دیکھ کر بھی کر سکتے تھے۔  
لیکن انہیں تو لوگوں کی اصلاح کا فریضہ انجام دینا تھا۔ ان کے دلوں پر حکمرانی کرنی تھی نہ  
کہ صرف ان کے جسموں پر۔ دنیا دار حاکموں، اُمراء اور سیاست دانوں اور اللہ کے  
برگزیدہ بندوں کے راستے اور طریق کار جدا جدا ہوتے ہیں۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق  
اس فرق کو یوں واضح کرتے ہیں :-

"یہاں وجہ ہے کہ علماء و اُمراء بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے وہ کام نہیں  
ہو سکتا جو فقیر اور درویش کو گزرتے ہیں۔ بادشاہ کا دربار خاص ہوتا ہے اور فقیر  
کا دربار عام ہے۔ جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب، عالم جاہل کا کوئی امتیاز  
نہیں ہوتا۔ بادشاہ جان و مال کا مالک ہے لیکن فقیر کا قبضہ دلوں پر ہوتا ہے اور  
اس لئے بادشاہوں کا اثر محدود ہوتا ہے اور درویشوں کا اثر بے پایاں۔ یہی  
سبب ہے کہ درویش کو وہ قوت و اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ بڑے بڑے جبار اور  
باجبروت بادشاہوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔"

پھر جہاں تک خود پیر بابا علیہ الرحمۃ کی ذات کا تعلق ہے وہ پرہیزگار اور  
سیاسی رقابت سے بالاتر ہے۔ اگر بانی دین انصاری کی مشروع کی ہوئی تحریک کا مقابلہ اور دیکھا

تو خون در دیزہ سے کیا۔ ہو سکتا ہے جوشِ مجاہدانہ میں وہ تلخ بیانی یا زیادتی پر اتر آئے ہوں یا عریضوں نے ان کی تحریروں میں ایسی تخریب کر دی ہو۔ جس سے ان کی ذابت پر حرت آنا ہو۔ یہی بات بائزید انصاری پر بھی صادق آ سکتی ہے، دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ فریقین کے سیاسی نظریوں اور رویوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی ان کے مذہبی عقائد اور تحریروں میں کئی متنازعہ امور ضرور ہوں گے۔ اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں تک صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا تعلق ہے پیر بابا حضرت سید علی غواص ترمذیؒ کی خدمات جلیلہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا شمار اس علاقے کے سب سے بڑے محسنوں میں ہوتا ہے۔ ہزاروں لوگوں نے ان سے فیض پایا اور آج بھی ان کا روحانی فیض کا سلسلہ جاری و ساری ہے، اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی تبلیغی کوششوں کا اعتراف ایک بزرگ دانش ور اور صاحبِ نظر ہستی نے یوں کیا ہے:

”مسلمان درویش پرخطر اور دشوار گزار راستوں، سرنجدک پہاڑوں اور لہق و وق بیابانوں کو طے کر کے ایسے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں کوئی اسلام اور مسلمانوں کے نام سے بھی واقف نہ تھا اور جہاں ہر چیز اجنبی اور ہر بات ان کی طبیعت کے مخالف تھی جہاں کی آب و ہوا، موسم و رواج، صورت و شکل، آداب و اطوار، لباس ایت چیت غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو اہل ملک سے اور اہل ملک کو ان سے وحشت ہو۔ لیکن حال یہ ہے کہ ان کی دنیا کے سینکڑوں سال بعد بھی ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا ان کے آستانوں پر حاضری دینے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور جن جن مقامات پر ان کے قدم پڑے تھے وہ اب تک ”مشرقی“ اور مقدس کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ کیا بات تھی؟

بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کو کھینچنے کا وہ سامان تھا جو نہ امرار و سلاطین کے پاس ہے اور نہ علماء و حکماء کے پاس ہے۔“

لے اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (ڈاکٹر مولوی عبدالحق)



حضرت پیر باباؒ بھی ایک ایسے ہی مروجہ شناس تھے۔ اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر وہ مسلمان عوام کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ علماء سوء اور جھوٹے پیروں کی مخالفت وہ محض اس لئے کرتے تھے کہ ان لوگوں نے دور از کار باتوں میں لوگوں کو الجھا رکھا تھا۔ وہ باطنی انوار اور مدارج کے دعویدار تھے۔ فروعات میں پھنسے ہوئے تھے اور لوگوں کے سامنے اسلام کی سادہ اور موثر تعلیمات پیش کرنے کی بجائے اپنی "کرامتیں" دکھانے پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اس کے برعکس پیر باباؒ کا اصل کام لوگوں کو اسلام کے بنیادی ارکان کا پابند بنانا تھا۔ وہ پختون قوم کی صلاحیتوں اور اس کی ذہنی اتناوے سے بخوبی واقف تھے، اپنے مشن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

یہ بات پختونوں کی سرشت میں داخل ہے کہ جب وہ کسی پیر فقیر کی آمد کا سنتے ہیں تو اسے ملنے ضرور جاتے ہیں اور یہ قوم ذریک اور عقل مند لوگوں سے خالی نہیں مگر اپنی بے علمی کی وجہ سے لوگ بعض گمراہوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں تاہم اگر ان کو حق و باطل کے مابین مباحثہ یا مناظرہ سننے کا موقع ملے تو وہ اپنی خداداد فراست کی وجہ سے حق و باطل میں تمیز بہت جلد کر سکتے ہیں۔

جب میں علاقہ سدوم پہنچا تو اطراف و جوارب سے جوق در جوق

لوگ ملاقات کے لئے آنے لگے۔ میں نے اپنے مواعظ میں بار بار انہیں شریعت

مسطہ کی پابندی کی طرف تامل کیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم دی۔

لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات ذہن نشین کرائیں۔ الحمد للہ! میری کوششیں ایسا

نہ گئیں اور ہر جوان دہیز مرد اور عورت شریعت مصطفویٰؐ کی پیروی اور پابندی

کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھنے لگا۔

یہ حضرت پیر باباؒ اور دوسرے اہل اللہ کی انہی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تعلیمات یہاں کے لوگوں کے دلوں میں ماسخ ہوتی گئیں۔ لوگ دین محمدیؐ کے شیدائی بن گئے۔

اور قبائلی علاقے اسلام کا ایسا مرکز بن گئے جہاں سے شریعت، طریقت، جہاد فی سبیل اللہ اور آزادی وطن کی جدوجہد کے وہ چشمے پھوٹے جن سے برصغیر پاک و ہند سرسبز و شاداب ہو گئے۔ اہل حدیث ہمیشہ مسلمان فاتحین اور غازیوں کے لشکر کے ہراول دستوں میں شامل رہے۔ برصغیر کی سیاست میں انہوں نے شاندار کردار بجالایا۔ رامپور، فرخ آباد، رومیل کھنڈ اور بھوپال کی اسلامی ریاستیں قائم کیں، جب کبھی دین پر کوئی کڑا وقت آیا۔ یہی پختون اسلام کی ڈھال بن گئے، شہنشاہ اکبر کے "دین الہی" کی سیاہی کو مٹانے کے لئے انہوں نے امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بھرپور ساتھ دیا۔ غازی اسلام احمد شاہ ابدالی کے فاتحانہ لشکر میں واد شجاعت دیتے ہوئے انہوں نے مرٹوں کے رام راج کے مضمویے خاک میں ملا دیئے۔ فرنگی کے خلاف مسلسل ڈیڑھ سو برس تک نبرد آزما رہ کر انہوں نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا تو آزادی وطن کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں میں وہ آگے آگے رہے۔ پٹھانوں میں دین اسلام سے محبت کرنے اور قومی زندگی میں انہیں باعزت مقام دلانے میں مشائخ حرام اور صوفیائے عظام کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں اور ان محسنوں کی جتنی بھی قدر افزائی کی جائے کم ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی جغرافیائی پوزیشن اور اتنا دطبع کی وجہ سے پٹھان کو مسلسل اور متواتر جنگوں اور خون ریزیوں میں مصروف رہنا پڑا۔ ان کے ہاتھ میں شمشیر و سنان اور طبل و علم تو دکھائی دیتے لیکن قلم و قرطاس کی طرف توجہ دینے کا موقع انہیں نہ مل سکا کسی وقت بھی انہیں آرام سے بیٹھنے اور اپنے بزرگوں کے کارناموں کو محفوظ کرنے کے لئے وقت میسر نہ آیا۔ اگرچہ یہاں کے مشائخ حرام اور شاہیر نے شاندار کارنامے انجام دیئے تھے لیکن معرض تخریب میں نہ آنے کی وجہ سے وہ کارنامے عوام کے سامنے نہ آسکے۔ یہاں تک کہ غوث خراسان، ہادی گم گشتگان، حامی سنت، امحی بدعت سید علی خواص ترمذی المعروف پیر بابا بونیری علیہ الرحمۃ جیسی عظیم ہستی کے حالات پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا رہا۔ چند کتابچے شائع ہوئے بھی تو وہ ان کے مرتبہ و مقام کے شایان شان ہرگز نہ تھے۔ اس لئے اس امر کی

ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ اس سرسراج اولیاء۔ سلطان الاصفیاء کی حیات و تعلیمات سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔ زیر نظر کتاب ہی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ کرے شرف قبولیت پاتے۔

اس کتاب کی تالیف میں سب سے زیادہ بھروسہ مدبر سیاستدان اور محقق تاریخ دان سید عبدالجبار شاہ ترمذی ستھانوی کی خود نوشتہ پر کیا گیا ہے۔ مورخ سرحد علامہ قاضی عبدالعلیم اثرانغانی کی نگارشات بھی ہمارے لئے مشعل راہ بنی رہیں اور مرحوم سجادہ نشین دربار پیر بابا بونیری سید معین الدین باچا کا مرتب کردہ ”تذکرہ“ بھی مدد و معاون ثابت ہوا۔ ہم ان سبھی حضرات کی خدمات جلیلہ کے ولی معترف ہیں۔

دنیا میں کوئی انسانی کوشش بھی تکمیل کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور علمی کم مائیگی کا اعتراف ہے۔ قادرین کرام سے التماس ہے کہ مجھے میری غلطیوں اور فرورگذاشتوں سے مطلع کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن مرتب کرتے وقت ان مشوروں اور نکات پر عمل کیا جاسکے۔

آفریں میں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب فضیلت مآب الحاج سید محمود شاہ صاحب ترمذی کی تحریک پر اور انہی کی نگرانی میں لکھی گئی۔ شجرہ نسب اور آفری ابواب بھی انہوں نے ہی مرتب کئے اور کتاب کی اشاعت و طباعت کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ ان کی سرپرستی ہی کتاب کی تالیف کا سبب بنی۔

مخدومی محترم اعلیٰ حضرت حافظ الحاج قاضی محمد عبدالدائم دامت برکاتہ نے مجال مہربانی سے مسودہ پر نظر ثانی فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ خداوند کریم انہیں جزائے خیر دے اور ان کی مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے۔

خادم: محمد شفیع صابر

۲/۳ خالد لین، فورٹ روڈ

پشاور چھاؤنی

# عظیم خانوادہ

کوئی مذہب دعوت و تبلیغ کے بغیر اشاعت نہیں پاسکتا، نہ کسی مذہب کا وجود دعوت و تبلیغ کے بغیر دیر پا ہو سکتا ہے، اسی لئے جہاں اسلام میں دعوت و تبلیغ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ وہیں مبلغین دین کو بہت عزت کا مقام بھی دیا گیا ہے۔ جن بزرگان دین نے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں اسلام کو پھیلایا ان میں سید علی غواص (پیر بابا) علیہ الرحمۃ کا مقام بہت بلند ہے۔

سید علی غواص ترمذی حسینی سید تھے، آل رسول سے عقیدت اور ان سے محبت ہمارے لئے لازمۃ ایمان ہے۔ پھر اس عظیم خانوادہ کی ہر وہ ہستی جو عالم ربانی اور عارف حقانی ہو، نور علی نور ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ واجب التعظیم اور قابل احترام ہے۔ ایسے عالم باعمل سید کی محبت اور بھی زیادہ باعث ثواب ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے قُلْ لَا اسْتِغْنَاكُمْ عَلَیْهِ  
فَضَائِلُ سَادَاتِ | اَجْرًا اِلَّا اَهْوَدَا۟ فِی الْقُرْبٰی اُمَّتِ سَلَمَہُ كَہٗ فِرْدُ كُوہِدُ

کہ میں تم سے تبلیغ رسالت و احکام کی کوئی اجرت نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے اقربا سے محبت اور ان کی عزت سکون صاحب کثافات اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے دریافت کیا "یا رسول اللہ! آپ کے قرابت دار کون ہیں جن

کی تعظیم ہم پر واجب قرار دی گئی ہے۔ ”حضرت نے فرمایا۔ ”علی، فاطمہ، حسن اور حسین اور ان دونوں کی اولاد۔“

کشاف کی ایک روایت یوں بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ”اپنے اللہ سے پیار کرو، ہر صبح اس کی نعمتوں کا شکر یاد کرو مجھے اس لئے دوست رکھو کہ اللہ خود مجھے دوست رکھتا ہے اور میری خاطر اور میری خوشنودی کی خاطر میری اولاد سے محبت کرو۔“ اس سے معلوم ہوا کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے جو اصل ایمان ہے اسے حضرت کی خوشنودی کے لئے ان کی اولاد کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھنا ضروری ہے صاحب کشاف زاہد سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اہل بیت رسولؐ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے، اللہ اس پر رحمتیں نازل کرتا ہے اور اس کے ساتھ نیکی اور شفقت کا برتاؤ کرتا ہے۔

کشاف میں ایک دوسری جگہ یوں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”اے لوگو! جان لو، جو کوئی محمدؐ کی اولاد سے محبت کرے گا، اس کا خاتمہ ایمان کامل پر ہوگا۔ جو شخص محمدؐ کی اولاد پر جان چھڑکے گا وہ پل صراط سے ثابت قدمی سے گزرتے گا کیونکہ محمدؐ کی اولاد کی محبت اور دوستی کی خاطر جان دینا شہادت کا مقام حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جو کوئی میری اولاد کی محبت اور دوستی کی راہ میں جان و مال قربان کرے گا اسے اس زیب و زینت اور شان و شوکت سے جنت میں بھیجا جائے گا جیسے وہن کو بناؤ سنگھار کے بعد شوہر کے ہاں بھیجتے ہیں۔ تم میں سے جو کوئی محمدؐ کے فرزندوں کی محبت میں مرے گا۔ وہ اہل سنت و الجماعت کے طریقہ پر مرے گا اور درد سے نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص مہین یعنی مجھے اور میرے اہل بیت کو دوست رکھے اور میری اولاد کی تعظیم و تکریم کرنے والے کو محبوب رکھے، اللہ تعالیٰ اسے میرا ہم نشین بنائے گا گویا اس روایت میں عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ

صحابہ کرام اہل بیت رسولؐ سے بہت ہی محبت کیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں اور بھی بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جن سے آپؐ کی اولاد سے محبت کے وجوب کی دلیل ملتی ہے، ان مختصر صفحہ میں ایسی حدیثوں کا اضافہ کرنا ناممکن ہے۔

کتاب "اشرف النبوة" اور "درر" میں حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن اور حسینؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "جس نے مجھے اور ان دونوں بچوں کو اور ان کے ماں باپ کو دوست رکھا وہ قیامت میں ضرور میرے ہمراہ بہشت میں داخل ہوگا"۔ اور یہ بھی فرمایا کہ "جس نے ہمارے اہل بیت کی محبت کو گٹھے لگایا اور ان کی محبت میں جان دی یا میری محبت میں مارا گیا وہ خوش قسمت اور قابل مبارک ہے اور ایسے شخص کے لئے جنت سجدی گئی ہے"۔

"اشرف النبوة" میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "قیامت میں میں چار قسم کے لوگوں کا شفیع ضرور ہوں گا خواہ وہ روئے زمین کے تمام گناہ ساتھ لے کر آئیں۔ پہلا وہ گروہ جو میری اولاد کی محبت اور تعظیم کرے، دوسرا وہ جو ان کی حاجت براری اور ضروریات پوری کرنے میں مصروف نظر آئے۔ تیسرا جو ان کی پردہ پوشی کرنے والا ہو اور چوتھا وہ جو انہیں (اہل بیت کو) دل و جان سے عزیز رکھتا ہو۔" مصابیح وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، خدا کی کتاب اور اپنی عزت۔ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے۔ میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔" "کشاف" اور "اشرف النبوة" میں ہے کہ حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے میرے اہل بیت پر ستم کیا اور میری اولاد کو ایذا پہنچائی اس پر جنت (یقیناً) حرام ہے۔ مصابیح کے الفاظ یہ ہیں

کہ فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اس کو ایذا پہنچانا مجھے ایسا پہنچانا ہے اور اے ناراض کرنا مجھے ناراض کرنا ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے "اگر میری اولاد میں سے کوئی نبی ہوتا تو میں خاتم الانبیاء نہ رہ سکتا۔ اگرچہ میرے فرزند (حسنؓ اور حسینؓ) نبی نہیں ہیں پھر بھی جنت کے جوانوں کے سردار ضرور ہیں۔"

ابن عساکر ابن بخاریؒ حضرت حسن بن علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "دیکھو! میرے حسنؓ و حسینؓ کو برا نہ کہنا کہ وہ بہشت کے اولین اور آفرین لوگوں کے سردار ہیں۔" ضیاء حدیقہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ جبریلؑ نے مجھے خوشخبری اور مبارک دی کہ حسنؓ اور حسینؓ عرش کے دو گویا نایاب ہیں۔ ابن عساکر ابان و انسؒ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اہل مجلس میں سے کوئی بھی کسی کے لئے تعظیماً کھڑا نہ ہوا کرے۔ البتہ حسنؓ اور حسینؓ اور ان کی اولاد کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا روا ہے۔"

واضح ہو کہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (صاحب تفسیر بحر مواج) نے رسالہ مناقب اہل بیت میں بہت سی حدیثیں اس بارے میں نقل کی ہیں اور اس رسالہ کا ایک پورا باب خاص قیام و تعظیم اولادِ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں ہے۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کوئی روایت کے مناقب میں شیخ ابوسعید ماورویؒ لکھتے ہیں کہ آپ (امام اعظم ابوحنیفہؒ) سادات کرام کی توقیر و احترام اور علویوں کی تعظیم و اکرام کا اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ایک دن مجلس برپا تھی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ امام صاحبؒ بہت سی دفعہ تعظیماً اٹھتے اور پھر بیٹھ جاتے۔ لوگوں کو چونکہ اس کا ظاہری سبب معلوم نہ تھا اس لئے بالآخر انہوں نے دریافت کیا کہ مجلس میں جناب کے بار بار اٹھنے کا کیا سبب ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ ان میں ایک بچہ علوی ہے، جب وہ سامنے سے گزرتا ہے تو تعظیماً اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ جناب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شیخ امان اللہ پانی پتیؒ کے احوال میں تحریر فرماتے ہیں۔

”کہ میرے والد شیخ سیف الدینؒ نے فرمایا کہ شیخ امان قدس سرہ جب طالبانِ دین کو سبق پڑھا رہے ہوتے اور سادات کے نیچے کھیلتے ہوتے سامنے آجاتے تو تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے اور جب تک وہ کھیلتے رہتے آپ کھڑے ہی رہتے۔ لوگوں نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا۔ ”امان کی کیا مجال ہے کہ اولادِ رسولؐ کھڑی رہے اور امان اُن کے سامنے بیٹھا ہے۔“ اسی طرح حضرت امام شافعیؒ کے متعلق منقول ہے کہ وہ ساداتِ کرام کے ادب و احترام میں اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ لوگوں نے انہیں ”رافضی“ کہنا شروع کر دیا۔ جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا :-

لَوْ كَانَ رِفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ فَلَيْسَ هُدًى الثَّقَلَيْنِ آتِي رَافِضًا

اگر محض آلِ محمدؑ کی محبت رِفض کہلاتی ہے تو دونوں جہان گو اہی دیں کہ میں رافضی ہوں! جہاں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کہنا ہے کہ ”میرے اہل بیتؑ کی مثال کشتیِ نوح کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا نجات پگیا“ وہیں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ”میرے اصحابؓ تاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کسی کی اقتدار کرو گے ہدایت کو پا لو گے“

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان اور محبت کے بارے میں بہت سی احادیث موجود ہیں لہذا اہل سنت والجماعت (جس کے عقائد کو اپنا لئے بغیر کوئی مومن درجہ ولایت کو پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی سچا مومن کہلا سکتا ہے) کا ایمان ہے کہ جس طرح اہل بیتؑ کی محبت مسلمان کا فرض منصبی ہے، اسی طرح اصحابِ رسولؐ خدا کی دوستی کو باعثِ فخر و نجات سمجھنا بھی فرائض میں داخل ہے۔ یہ دونوں محبتیں لازم ملزوم ہیں اور ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جس طرح بمطابق فرمانِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو شخص اہل بیتؑ کی کشتی میں سوار ہو گیا، ساحلِ نجات پر پہنچ گیا اور جس نے اس میں بیٹھنے سے انکار کیا وہ گردابِ بلا میں پھنس کر غرق ہو گیا۔ اسی طرح حضورؐ کا یہ فرمان بھی آنکھوں کو روشنی بخشنے والا ہے کہ ”میرے اصحابؓ روشن تاروں کی طرح ہیں اور ان کا اقتدار باعثِ ہدایت ہے۔“



سوچنے کی بات ہے کہ جس طرح ستاروں کی روشنی اور رہنمائی کے بغیر گھپ اندھیری رات میں کشتی کا کنارے پر پہنچنا محال بلکہ ناممکن ہے۔ اسی طرح محبت اہل بیت کی کشتی بھی صحابہ کرام کی محبت کی روشنی کے بغیر ایمان کے دریا میں ساحلِ مزاد پر نہیں پہنچ سکتی۔

”نطائف“ میں امام فخرالدین رازیؒ بھی اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اہل بیتؑ اور صحابہ کرامؓ کی محبت یکساں باعثِ فلاح و اربین ہے۔ مختصراً یوں سمجھنا چاہیے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چاروں خلفاء افضل البشر ہیں، ان کے بعد عشرۃ مبشرہ ہیں جن میں یہ چاروں خلیفہ بھی شامل ہیں۔ پھر ان کے بعد اہل بدر کو تمام صحابہ کرام پر فضیلت حاصل ہے جن کی تعداد ۳۱۳ ہے اور جن میں چاروں خلیفہ اور عشرۃ مبشرہ شامل ہیں (قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر کے برأت کی سند لکھ دی۔ اصحاب بدر کے بعد اصحاب اُحد ہیں، اُحد کا معرکہ وہ زبردست معرکہ تھا جس میں جناب سید الشہداء حضرت حمزہؓ اور شہید حلیل القدر صحابہؓ نے شہادت پائی۔ اصحاب اُحد کے بعد سب سے بڑا مرتبہ ان اہل ایمان کا ہے جنہوں نے ببول کے درخت کے نیچے اپنی عزیز جانیں اور اپنا مال اور اولاد اللہ اور اس کے رسول مقبولؐ کی راہ میں قربان کرنے کا اقرار اور عہد کیا۔ جسے بیعت رضوان بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں وہ تمام صحابہ کرام شامل ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اس طرح ان اصحابؓ کی کل تعداد تیرہ سو کو پہنچتی ہے۔

جہاں تک مرتبہ و مقام کا تعلق ہے اس کے باقی تمام لوگوں میں صحابہ کرام کو فضیلت حاصل ہے، ہمارے علمائے سلف اور شائخِ خلف کا بھی یہی اعتقاد ہے۔ بڑے صغیر پاک و ہند میں اسلام کی اشاعت کا سہرا جن علمائے ربانی اور شائخِ عظام کے سر ہے وہ سب اسی عقیدہ کے علمبردار تھے۔ خود حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا علیہ الرحمۃ بھی عمر بھر اسی عقیدے پر قائم رہے اور اسی عقیدے کی اشاعت و تبلیغ میں زندگی گزار دی۔ وہ جہاں طالبانِ حق کو علوم ظاہری سے آراستہ کرتے وہیں انہیں معرفت الہی کے اسرار و رموز سے بھی آگاہی بخشتے۔

## حضرت پیر بابا کے نام و اسلاف

اعلیٰ حضرت غوث زمان سید علی غواص المعروف پیر بابا علیہ الرحمۃ کے نامور اسلاف کرامؒ میں ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی شامل ہیں تو دوسرے مشائخ کرام بھی۔ یہ سبھی حضرات اپنے اپنے دور کے صاحبان کمال اور شناسایان معرفت تھے اس لئے ان کے محامد و محامن کا احاطہ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس کے باوجود ہم تبرکاً حضرت پیر بابا کے ان اسلاف کرام کی اسلامی خدمات سے قارئین کرام کو روشناس کرانا ضروری گردانتے ہیں۔ مقصود ان کی عظمت کا اعتراف اور ان کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرنا ہے، ان میں سے ہر صاحب کمال کی ذات وہ مینارۃ نور ہے جس کی روشنی طالبان حق اور متلاشیان معرفت کی ہمیشہ رہ نمائی کرتی ہے گی۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ  
امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ - وجہ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے چچا زاد تھے بلکہ انہیں حضور سرور کائنات کا داماد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، حضور پر نور کی صاحبزادی سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراءؑ ان کے عقد میں تھی۔ ان کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی۔ پچپن ہی سے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر تربیت رہے، بعثت رسولؐ کے وقت ان کی عمر آٹھ دس برس کی تھی۔ بچوں میں سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے میں انہیں اولیت کا فخر حاصل ہوا۔ ۳۵ ہجری میں مسند خلافت پر بیٹھے اور شکہ ہجری کے رمضان المبارک میں کوفہ کی مسجد میں مشقی القلوب عبدالرحمن بن ملجم کے ہاتھوں زخمی ہو کر شہید ہوئے۔ ان کی ولادت اور شہادت کے بارے میں کسی نے خوب کہا ہے

کے رامیشیرہ شد ای سعادت بکعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے بڑے قدر دان تھے۔ ان کی  
 رفعت علمی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے، 'أَنَا مَدِينَةٌ  
 أَعْلَمُ وَعَلِيٌّ بَابُهَا دُنِيَ عِلْمِ كَاشِهَرِمْ هُوَ' اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔ اُن کی  
 عظمتِ شان کی گواہی بھی خود دنیا کی اس سب سے برگزیدہ ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ  
 وسلم نے یوں دی ہے۔ 'أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ  
 لَا نَبِيَّ بَعْدِي' تو میرے نزدیک ایسا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کے لئے ہارونؑ۔  
 مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا حضور پر نورؐ ہی کا ارشاد ہے 'مَنْ كُنْتُ مَوْلَاَهُ  
 فَعَلَىٰ مَوْلَاهِ اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَآلَاةٌ وَعَادٍ مِنْ عَادٍ' (غدير خم کے  
 موقع پر سردارِ انبیاءؑ نے فرمایا۔ میں جس کا بھولی (دوست) ہوں، علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔  
 خدایا جو علیؑ سے دوستی رکھے تو اس سے دوستی رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے تو  
 اس سے دشمنی رکھ)

امام الاولیاء حضرت علیؑ بارہ اماموں میں سے پہلے امام ہیں اور اکثر اولیائے کرام  
 کا سلسلہ آپ پر منتہی ہوتا ہے۔

آپ کا روضہ باختلاف روایات نجف اشرف (عراق) میں ہے۔

امیر المؤمنین حضرت امام حسنؑ - اگرچہ حضرت پیر باباؑ کا شجرہ نسب والد کی  
 طرف سے حضرت امام حسنؑ سے نہیں ملتا

تاہم مادی سلسلوں کا تعلق اُن کی ذاتِ گرامی سے ضرور ہے۔ اسی لئے یہاں آپ کا  
 ذکر بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

آپ دوسرے امام ہیں اور حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کے سب سے بڑے صاحبزادے  
 ہونے کی وجہ سے بے حد عزت و احترام کے مالک ہیں۔ آپ کی ولادت ۳؎

میں ہوئی۔ حضورؐ ہی کے ہاتھوں میں پلے بڑھے، آہنی ۳ کے اخلاقِ حسنہ کو اپنایا، یہاں تک کہ امام حسنؑ کے جسمِ اطہر کا اوپر والا آدھا حصہ یعنی سینہ مبارک سے ستر تک اپنے نانا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے حد مشابہ تھا۔ ۹۹ ہجری میں بیوی کے زہر دینے سے وفات ہوئی۔ مدینہ منورہ کے جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت امام حسینؑ - اور بارہ اماموں میں سے تیسرے امام ہیں، ان کا سال

ولادت ۴ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذریعہ وحی اُن کا نام حسینؑ رکھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے "حسن" کا نام بھی حضورؐ بذریعہ وحی تجویز کر چکے تھے۔ امام حسینؑ کے جسم کے بچے دھڑ میں حضورؐ سے مشابہت رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے باپ سے فرمایا تھا کہ "یہ دونوں جنتیوں کے سردار ہیں"۔ نیز فرمایا کہ میری نسل انہی دو صاحبزادوں سے چلے گی" اسی لئے ان کی اولاد کو شرفِ سیادت حاصل ہے اور اللہ نے اس میں بڑی برکت دی ہے، حضرت امام حسینؑ نے دس محرم الحرام ۱۰ھ کو جمعہ کے دن کربلا کے مقام پر شہادت پائی، کہتے ہیں کہ ان کی شہادت کے دن بیت المقدس کے جس پہر کو اٹھایا جاتا اس کے نیچے سے تازہ خون ملتا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ شہادت کے دن آسمان سرخ ہو گیا تھا۔

امتِ محمدیہ کے تمام علماء، صلحاء اور شعراء نے حضرت امام حسینؑ کے حضور بڑے ادب سے نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے، ایک بزرگ کا کہنا ہے :-

شاہِ است حسین و پادشاہِ است حسین      دیں است حسین و دینِ پناہ است حسین  
سرفراد و نداد دستِ در دستِ یزید      حقا کہ بنائے لالہ است حسین  
مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے :-

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد  
حکیم الامت اقبال حضرت امام حسین کی شان میں کہتے ہیں۔

سہ آن امام عاشقاں پور بتولؑ سرو آزادے زبستانِ رسولؐ  
بہر دیں در خاک و خون غلطیہ است تابناکے لالہ گردیدہ است  
نقشِ اللہ بر صحرا نوشت حرفِ عنوانِ نجاتِ مانوشت

تا قیامت قطع استبدادِ سود

موجِ خونِ او چمنِ ایجا دکرد

حضرت امام علی زین العابدینؑ  
امام علی زین العابدینؑ حضرت امام حسینؑ کے  
صاحبزادے اور بارہ اماموں میں سے چوتھے

امام ہیں۔ سانحہ کربلا پیش آیا تو ان کی عمر تقریباً تیس سال کی تھی، چونکہ اس وقت  
فلاکت کی وجہ سے صاحب فرشتے تھے اس لئے جنگ میں حصہ نہ لے سکے، عبادت  
اس کثرت سے کرتے تھے کہ ان کا لقب "زین العابدین" پڑ گیا۔ روایت ہے کہ ہزار رکعت  
نفل روزانہ پڑھا کرتے تھے۔ وضو فرماتے تو ان کا چہرہ زرد پڑ جاتا اور جسم اظہر پر لڑہ  
طاری ہو جاتا تھا۔ کسی نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا فرمایا، "تم جانتے ہو کسی کے  
حضور میں حاضری کا وقت ہے؟" وفات ۹۵ ہجری میں ہوئی، مدینہ منورہ کے قبرستان  
جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حضرت امام حسین کا سلسلہ نسب حضرت امام زین العابدین ہی سے جاری ہوا۔  
اللہ کی شان ہے کہ اکیسے امام زین العابدینؑ سے چلنے والی نسل کو کس قدر برکت اور کثرت  
دی۔ آج دنیا کے ہر گوشہ میں کتنے سید آباد ہیں، اس کے برعکس یزید کے پندرہ بیٹے  
تھے لیکن وہ مقطوع النسل ہو گیا اور آج دنیا میں اس کا کوئی نام لیا تک نہیں۔  
حضرت امام محمد باقرؑ حضرت امام محمد باقرؑ حضرت امام زین العابدینؑ کے

صاحبزادے اور جانشین ہیں، ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ۷۷ ہجری میں یعنی سانحہ کربلا کے قریباً تین سال پیشتر ہوئی — ان کی والدہ ماجدہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی صاحبزادی فاطمہ بنت محمد بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا تو آپ نے فرمایا "اے جابر! تم اس وقت موجود ہو گے جب میری اولاد میں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جس کا نام محمد بن علی بن حسین ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو نورو حکمت عطا فرمائے گا۔ تم اس سے ملو تو میرا سلام کہہ دینا۔"

حضرت امام باقرؑ نے ۱۳ ہجری میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ مزار مبارک جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ - چھٹے امام اور امام باقر کے صاحبزادے ہیں۔ والد ماجد کا نام ام فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ ہے۔ یہ ام فروہ اسماء بنت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں۔ امام جعفر صادقؑ کی ولادت ۸۳ ہجری میں ہوئی۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کو خرد و شرف و فضیلت دونوں طرف سے حاصل ہے ایک باب مدینۃ العلم حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے اور دوسرے اپنے نانا حضرت قاسمؑ سے۔ حضرت قاسمؑ کی نسبت حضرت سلمان فارسیؓ سے تھی اور حضرت سلمان فارسیؓ کی نسبت ابوبکر صدیقؓ سے۔ اسی لئے آپ اس دوسری نسبت پر فخر فرمایا کرتے تھے۔ ان کا قول ہے **وَلَدَنِي أَبُو بَكْرٍ مَسْنِينٌ** (میری ظاہری اور باطنی ولادت و نسبت حضرت ابوبکرؓ سے دوسری ہے) آپ کی ذات اقدس میں سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اور دوسرے سلاسل طریقت اکٹھے ہو گئے ہیں لہذا آپ طریقت کے مجمع البحرین ہیں یعنی صدیقی اور علوی دونوں نسبتوں کا مخزن ہیں، حضرت امام اعظم امام ابوحنیفہؑ حضرت امام جعفر صادقؑ کے شاگرد اور مرید ہیں۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی وفات ۱۴۸ ہجری میں ہوئی۔ آپ جنت البقیع کے قبۃ اہل بیت میں دفن ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری (لاہوری) علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ اتنے علو مرتبت کے باوجود آپ کی عاجزی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اپنے مولیٰ (غلام) کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے کہ فرمایا: "آؤ! ہم عہد کریں کہ ہم میں سے جس کی نجات روز قیامت پہلے ہو جائے وہ باقی سب کی سفارش کرے"۔ حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا "اے ابن رسول اللہ! آپ کو ہماری سفارش کی کیا حاجت؟ خود آپ کے نانا محمد رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم تو تمام مخلوق کی سفارش فرمائیں گے۔ اس پر آپ نے ارشاد کیا "میں اپنے اعمال و افعال پر غور کرتا ہوں تو شرم آتی ہے کہ قیامت کے دن اپنے نانا جان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کیا منہ دکھاؤں گا"۔ سبحان اللہ! اللہ والوں کی کیا ہی باتیں ہیں۔ پندار علم اور عزت زہدان کے قریب تک نہیں بھٹکتا۔

حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ ساتویں امام اور حضرت  
 امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں، آپ دوسرے

آئمہ اہل بیت کی طرح علم و فضل کی انتہائی بلندیوں پر فائز تھے، زہد و عبادت، جود و سخا، صبر و شکر کی خوبیاں آپ کو اپنے عظیم آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی تھیں۔ طبیعت میں شان عفو اور حلم کو بڑا عمل دخل تھا، ہمیشہ غصہ و غضب سے بچے رہتے۔ اسی لئے آپ کو کاظم و غم و غصہ کو پی جانے والا کہا جاتا تھا۔

معاذین نے آپ پر بڑی سختیاں روا رکھیں مگر اللہ نے انہیں بڑی برکت اور کثرت ادلا سے نوازا۔ کئی روایات ہیں کہ ان کے بیس بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں تھیں۔ اولاد کا سلسلہ چودہ بیٹوں سے چلا، آپ کے فرزندوں میں سے اکثر نے علم و فضل کی دنیا میں بڑا نام پایا۔ بالخصوص ان کے فرزند امام علی رضا علیہ السلام کا علمی مقام بہت ہی بلند ہے۔ امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کا سال ولادت ۱۴۸ ہجری اور سال وفات ۱۸۳ ہجری ہے۔ ان

کا مرقہ مبارک بغداد کے محلہ کاظمین میں مرزح خاص و عام ہے۔

حضرت امام علی رضاؑ کا مقبرہ مملکت ایران کی سب سے بارونق  
اور مقدس زیارت گاہ ہے، روضہ مہبط انوار بھی ہے تو

ظاہری جمال و آرائش کے اعتبار سے فن تعمیر کا شاہکار بھی۔

حضرت امام علی رضاؑ گیارہ ذی قعدہ ۱۵۳ ہجری کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے  
وہ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے صاحبزادے تھے، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد  
حضرت موسیٰ کاظمؑ ہی کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ وہ اسی پاکیزہ اور نورانی ماحول میں  
پلے بڑھے۔ امام علی رضاؑ علم و فضل کے اعتبار سے بھی امتیازی شان کے مالک تھے  
اور زہد و اتقار میں بھی انتہائی بلندیوں پر فائز تھے۔ سلسلہ امامیہ کے پیروکاروں کے  
نزدیک وہ مجدد کے رتبے پر فائز تھے۔ خود عباسی خلیفہ مامون الرشید بھی ان کے علمی  
محالات کا معترف تھا، بتایا جاتا ہے کہ عباسی خلیفہ ان کا اتنا قدر دان تھا کہ اس نے  
اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی بلکہ امام علی رضاؑ کو اپنا جانشین بھی نامزد کیا  
عباسی حکمران کی خواہش پر امام علی رضاؑ مدینہ منورہ سے فراسان منتقل ہو گئے  
ان کا روضہ ایک قریہ میں طوس کے نواح میں تھا لیکن بعد میں امیر تیمور اور اس کے جانشینوں  
نے روضہ کے گرد خوبصورت عمارات تعمیر کرائیں اور یہاں ایک بہت بڑا شہر آباد ہو گیا  
جو مشہد امام رضاؑ کہلایا۔ آپ کی وفات کا سال ۳۰۳ ہجری ہے۔

ان کی وفات کے متعلق منقول ہے کہ ہارون الرشید کے بیٹے مامون الرشید  
نے انہیں اپنے ہاں بلایا۔ جب آپ تشریف لائے تو مامون کے سامنے پھلوں سے بھری  
ہوئی طشتریاں رکھی تھیں اور خلیفہ انگور کا ایک خوشہ ہاتھ میں لئے کھارہا تھا، حضرت  
امام علی رضاؑ کے آنے پر مامون اٹھ کھڑا ہوا، معانقہ کیا، پاس بٹھایا اور انگور کا خوشہ



انہیں پیش کرتے ہوئے عرض کی کہ "اے ابن رسول اللہ! کیا اس انگوڑے بہتر انگوڑا آپ نے دیکھا ہے؟" آپ نے فرمایا "اچھے انگوڑے بہشت میں ہوتے ہیں۔" پھر مامون نے اصرار کیا کہ وہ کچھ انگوڑے کھائیں۔ پہلے تو امام نے انکار کیا۔ بالآخر مامون الرشید کے اصرار سے انگوڑوں کے دو تین دانے کھائے، باقی رکھ دیئے اور اٹھ کر چل دیئے۔ مامون نے دریافت کیا "کہا تشریف لے جاتے ہیں؟" فرمایا "جہاں جانے کا حکم دیا گیا۔" باہر چلے آئے۔ ایک کمرے میں تھوڑی دیر آرام فرمایا۔ اس اشارے میں ان کے صاحبزادے امام محمد تقیؑ مدینہ طیبہ سے اپنے ام علی رضائے نے انہیں سینے سے لگایا۔ آنکھوں کو بوسہ دیا، اپنے بستر پر اپنے پاس لٹایا۔ دونوں منہ سے منہ لگا کر لپٹ گئے اور کچھ دیر دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ اسی حال میں تھوڑی دیر بعد آپ راہی ملک بقار ہو گئے۔

حضرت امام محمد تقیؑ اپنے سلسلے کے نویں امام اور حضرت  
 حضرت امام محمد تقیؑ جوادؑ امام علی رضاؑ کے صاحبزادے ہیں۔ ولادت ۱۹۵ ہجری

میں مدینہ منورہ میں ہوئی اور وفات معتصم باللہ کے عہد حکومت میں ۲۲۰ ہجری کو۔ ان کا روضہ اقدس بغداد کے علاقہ کاظمین الشریعین میں اپنے جد امجد امام موسیٰ کاظم علیہ الرحمۃ کے پہلو میں واقع ہے، اپنی تعمیر کے اعتبار سے ان کا روضہ نہایت ہی خوبصورت اور دلکش عمارت ہے جہاں صبح شام زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

منقول ہے کہ بچپن میں آپ دوسرے بچوں کے ساتھ بغداد کے کسی کوچے میں کھیل رہے تھے کہ اتفاقاً عباسی خلیفہ مامون الرشید شکار کو جاتے ہوئے ادھر سے گزرے۔ خلیفہ کی سواری کو دیکھتے ہی تمام بچے ادھر ادھر کھسک گئے لیکن امام محمد تقیؑ اسی جگہ کھڑے رہے جب مامون نے انہیں دیکھا تو کھوڑا دوک کر ان سے پوچھا "لڑکے! تم دوسرے بچوں کے ساتھ کیوں نہیں بھاگے؟" آپ چونکہ بچپن ہی سے بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے، اس لئے بلا جھجک جواب دیا۔ "امیر المؤمنین! راستہ تنگ نہیں، کافی کشادہ ہے! میرے یہاں مہر نے سے کوئی گاد

بڑھتی تھی۔ پھر میں کیوں بھاگتا؟ مامون کو آپ کی معصوم گفتگو اور بھولی بھالی پابیزہ صورت بہت بھلی لگی۔ پوچھا "نام کیا ہے تمہارا؟" جواب دیا "محمد"۔ پوچھا "کس کے بیٹے ہو؟" کہا "امام علی رضاؑ کے"۔ خلیفہ انہیں ساتھ لے گیا۔ بعد میں اس نے اپنی بیٹی ام الفضل آپ کے نکاح میں دے دی!

آپ کی اولاد کا سلسلہ امام علی نقی الہادی اور موسیٰ ابرق سے جاری ہے۔

امام علی نقی الہادیؑ امام علی نقی الہادیؑ سلسلہ امامیہ کے دسویں امام تھے، آپ حضرت ام علی نقیؑ کے فرزند ارجمند تھے، والدہ کا نام سیدہ ام الفضل تھا، اپنے نامور آباؤ اجداد کی طرح حضرت امام علی نقیؑ بھی ظاہری اور باطنی علوم میں نہایت ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور اپنے اخلاق عالیہ کی بدولت عوام میں برتری عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ امام علی نقیؑ پانچ رجب ۲۱۴ ہجری کو مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔

امام علی نقیؑ کا زمانہ عباسی خلیفہ متوکل باللہ کا دور حکومت تھا۔ متوکل باللہ نے مکان کے ایک حصہ میں مہتمم جانور پال رکھے تھے، یہ جانور اور پرندے ہر وقت بھانت بھانت آوازیں نکالتے اور اتنا شور مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی تاہم جب کبھی امام علی نقیؑ وہاں تشریف لاتے تو سب جانور پاس ادب سے بالکل خاموش ہو جاتے۔ جوہی آپ مکان سے رخصت ہوتے، پرندے اور جانور پھر اسی طرح شور مچانے لگتے۔

حضرت امام علی نقیؑ نے سہر جب ۲۵۴ ہجری کو داعی اجل کو لبیک کہا، ان کا مزار ایک پُر فضا مقام سامرہ میں ہے جو بغداد سے ترمیل شمال کو موصل جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ سامرہ کچھ عرصہ تک خلفائے عباسیہ کا دار الحکومت رہ چکا ہے، یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے واقع ہے۔

امام علی نقیؑ کی اولاد کا سلسلہ امام حسن عسکریؑ، جعفر ثانی اور ابو جعفر محمدؑ سے

آگے بڑھتا ہے۔

امام حسن عسکری رضی امام حسن عسکریؑ اپنے سلسلے کے گیارہویں امام ہیں اور حضرت

امام علی نقیؑ کے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ امام حسن عسکریؑ جمعہ دس ربیع الثانی ۲۳۲ ہجری میں مدینہ منورہ میں تولد ہوئے۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی، تاہم آپ امام عسکری کے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کی والدہ ماجدہ کا نام حدیثہ خاتون تھا، جب آپ کی ولادت ہوئی تو واثق باللہ بن معتمد باللہ بوسرا اقتدار تھا، ابھی آپ کی عمر چار ماہ کی تھی کہ والد نے انہیں اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ جب ان کے والد بزرگوار امام علی نقیؑ کو سامرو بلایا گیا تو آپ بھی ان کے ہمراہ تھے۔

حضرت امام حسن عسکری سے کئی کرامات سرزد ہوئیں۔ آپ کے اقوال بڑے شہرہ آفاق ہیں اور حکمت کا خزانہ سمجھے جاتے ہیں۔

ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے قید کی سختیوں اور تکلیفوں سے تنگ آ کر حضرت امام حسن عسکریؑ کو شکایت نامہ لکھ بھیجا تاہم شرم اور خود داری کی وجہ سے اپنی تنگ دستی کا حال نہ لکھ سکا۔ آپ نے میرے خط کا جواب عطا فرمایا۔ جس میں تحریر تھا کہ آج انشاء اللہ تم نماز ظہر اپنے گھر جا کر ادا کرو گے۔ چنانچہ نماز ظہر سے قبل ہی مجھے قید سے رہائی مل گئی اور نماز ظہر میں نے گھر پر جا کر ادا فرمائی۔ نماز سے فارغ ہوا کہ ایک شخص نے دروازے پر دستک دی، وہ حضرت امامؑ کا قاصد تھا۔ اس نے امام حسن عسکریؑ کا ایک خط اور ایک سو دنیا رہ مجھے دیئے۔ خط میں بھی لکھا تھا کہ جب تمہیں ضرورت ہو مجھ سے کوئی چیز طلب کرنے میں شرم نہ کیا کرو۔ جو چاہو گے انشاء اللہ تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔

شیعہ روایات کے مطابق امام حسن عسکریؑ کی شادی والد گرامی نے اپنی وفات سے قبل ہی محترمہ زہرا خاتون سے کر دی تھی جو قیصر روم کی پوتی اور شمعون وصی حضرت عیسیٰ کی نسل سے تھیں۔

حضرت امام عسکری جمعہ ۸ ربیع الاول ۲۶۰ ہجری کو اس وارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

انہیں اپنے گرامی قدر والد کے پہلو میں سامرہ ہی میں سپرد خاک کیا۔ آپ کے مزار پر بعد میں بہت خوبصورت مقبرہ تیار کیا گیا جہاں ہر روز دور دور سے ہزاروں زائرین آتے ہیں اور دونوں اماموں کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آپ کے تین فرزند ہوئے ہیں۔ قاسم۔ ابو عبداللہ علی اکبر اور محمد مہدی۔ آپ کی اولاد کا سلسلہ جناب ابو عبداللہ علی اکبر سے چلا۔

حضرت پیر بابا سید علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے اسلاف گرامی میں دوسرے لوگ بھی اپنی روحانیت اور اخلاقی پاکیزگی میں بھی بڑی شان کے مالک ہو گئے ہیں۔ ان میں سے چند حضرات کا تذکرہ یوں ہے۔

سرزمین سرحد اور افغانستان کے مشہور دینی پیشوا سید جلال گنج علم بخاریؒ

سرزمین سرحد اور افغانستان کے مشہور دینی پیشوا سید جلال گنج علم بخاری نہ صرف دنیائے طرفیت کی ایک ممتاز ہستی تھے بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ کے طور پر بھی انہوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ سلطان محمود غزنوی کے لشکر میں شامل ہو کر جہاد بالکفار میں مصروف رہے اور انہی معرکوں میں سے ایک میں شہادت کا درجہ پایا۔ آپ کا مزار مبارک موضع تالاش علاقہ دیر میں ہے۔

سید ناصر خسروؒ صاحب کمال و کرامات تھے۔ "حیات امیر" اور "زندہ پیر" کے ناموں سے بھی مشہور ہیں۔ آپ نے سرزمین

سرحد میں کئی مقامات پر قیام فرمایا اور تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ معتقدین نے بہت سی جگہوں پر جہاں جہاں آپ نے قیام فرمایا۔ آپ کی یادگاریں تعمیر کر دی ہیں۔ ایک ایسی ہی زیارت ثبوت میں بھی ہے

"تذکرہ سلطان الاولیاء کے مطابق سید ناصر خسروؒ سوات کے پہاڑوں رانولیا

اور حج شوقی وغیرہ علاقوں میں بھی کفار کے خلاف جہاد میں مصروف ہے اور چلیا کس اور تانبیر تک بھی گئے۔ اس راہ میں انہوں نے اپنی جان بھی قربان کر دی۔ بتایا جاتا ہے کہ سید ناصر خسرو رحمۃ اللہ علیہ ہجری کے قریب شہید ہوئے۔

مشہور بزرگ تھے، دنیوی وجاہت کے اعتبار سے بھی نمایاں سید احمد بنغیم حیثیت کے مالک تھے، بتایا جاتا ہے کہ امیر تیمور کی ہم شیران کے عقد میں تھیں۔ حضرت پیر بابا کی پانچویں پشت میں عبدالمجید سید محمد نور بخش ترمذی شاید اسی شہزادی کے بطن سے تھے۔

سید محمد نور بخش ترمذی رحمۃ اللہ علیہ، سید یوسف نور رحمۃ اللہ علیہ، سید احمد نور رحمۃ اللہ علیہ، سید یوسف نور رحمۃ اللہ علیہ سید محمد نور بخش ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

اور سید احمد نور رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اپنے وقت کے کاملین میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف اپنے علم و فضل کے اعتبار سے قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ بلکہ پشت در پشت سے سلسلہ کبریٰ میں ماذون اور مجاز تھے، ان لوگوں کے ارادت مند سب سے افغانستان، خراسان اور سمرقند علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، مغلیہ خاندان کے حکمرانوں سے قربت داری اور اپنے زہد و عبادت اور تقویٰ کی وجہ سے لوگوں میں بڑے مقبول اور ہر دل عزیز تھے، حضرت پیر بابا سید علی غواص ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کو اس سلسلہ طریقت کی خلافت اپنے محترم

سید السادات محمد نور بخش علیہ الرحمۃ کا انتساب سلسلہ کبریٰ میں حضرت ابواسحاق خلکانی سے تھا جو قطب الاقطاب سید امیر کبیر علی ہمدانی علیہ الرحمۃ کے داماد، خلیفہ ماذون اور جانشین تھے، آپ نے سردین ایران میں تصوف کے ایک نئے سلسلے کو فروغ دیا تھا جسے نور بخش سلسلہ کہا جاتا تھا ان کے ادران کے خلفاء کے ارادت مند خراسان، ایران، افغانستان اور ہندوستان تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی (دہلی) رحمۃ اللہ علیہ

دادا حضرت سید احمد نور بن سید یوسف نور بن سید محمد نور بخش ترمذیؒ سے حاصل ہوئی تھی۔

سید قنبر علیؒ سید قنبر علیؒ پیر بابا سید علی غواصؒ کے والد محترم تھے۔ وہ مغل حکمران شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے بہنوئی تھے۔ بعد میں شہنشاہ ہمایوں کی فوج میں سپہ سالار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ انہیں شاہی دربار سے امیر نظر بہادر کا خطاب ملا تھا۔ ان کے نام کے ساتھ میرزا بھی لکھا جاتا ہے جو اس دور میں ان لوگوں کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا جن کی قرابت شاہی خاندان سے ہو۔ آپ قندوز سے نقل مکانی کر کے علاقہ ترمذ کے موضع غلطان میں آباد ہو گئے تھے۔ اسی مقام کو حضرت پیر بابا سید علی غواص ترمذی علیہ الرحمۃ کی جائے ولادت ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

---

بذکر ایک مشہور و معروف وسیع الحلقہ شیخ طریقت گزے ہیں، جن کو اس سلسلہ کبریٰ کا فیض اپنی سید محمد نور بخش ترمذیؒ سے پہنچا تھا۔

## حیات مبارکہ پر باباً

ولادت :- ۹۰۸ ہجری : ۱۵۰۲ عیسوی

وفات :- ۹۹۱ " : ۱۵۸۳ "

مادہ تاریخ وفات: سید علی غواص نور الہی  
۱۵۸۳ء

”یوسف زئی قوم بھی کیا خوش قسمت قوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ولی کامل نے ہندوستان سے ایک غوثِ وقت کو ان کی اصلاح کے لئے بھیجا۔ اُس کی ذات سنگ پارس تھی جو اُس کے ساتھ لگا اُس نے اُسے سونا بنا دیا۔“

یہ ہیں وہ الفاظ جو حضرت انخون درونیرہ بابا نے اپنی ایک تصنیف کے دیباچہ میں پریربابا حضرت سید علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے بارے میں کہے۔ اور حقیقت ہے بھی یہی۔ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی دولت ایمان ہے، دنیا دار العمل اور آخرت کی کھیتی ہے جو یہاں سے ایمان سلامت لے گیا نوز و فلاح پا گیا۔ جس کا ایمان اور عقائد بگڑے، اُس کا اخلاق بھی غارت ہوا۔ اخلاق اور عقائد میں لغزش ہوتی تو انسان پھسل کر تحت الشریٰ میں جاگرا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جس سب سے بڑی نعمت کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ حضور آقائے نامدار، سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انسانی دنیا میں تشریف آوری ہی تو ہے، سلسلہ نبوت آپ کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوا تو اللہ نے اپنے دین کی اشاعت کا سامان یوں کیا کہ خود اسی امت کے صلحاء، علماء اور اقبیاء آگے بڑھے۔ اور انہوں نے پرچم اسلام کو تھام لیا۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی روشنی انہی نفوس قدسیہ کی بدولت پھیلی۔ شہنشاہوں کو اپنی سیاسی سرگرمیوں ہی سے فرصت کہاں تھی۔ ایسے میں ان اللہ والوں کا دم غنیمت تھا۔ جنہوں نے ہمہ تن اپنے آپ کو اسلام کے فزوغ و اشاعت کے لئے وقف کئے رکھا۔ پہلے انہوں نے اپنی اصلاح کی۔ ان کی اخلاقی برتری اور روحانی پاکیزگی دوسروں کے لئے مشعلِ راہ اور نمونہ بن گئی۔ چراغ سے چراغ جلتا رہا اور یوں سارا کفرستان ہند اسلام کے نور سے منور ہو گیا۔

جن لوگوں کو بونیر اور کوہستان سوات کی جغرافیائی پوزیشن کا علم ہے، وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چار پانچ سو سال پہلے ان دور افتادہ جنگلوں اور پہاڑوں میں بسنے والوں کا کیا حال ہوگا۔ کوئی مبلغ اسلام یا عالم دین وہاں پہنچنے نہ پایا تھا۔ لوگ اپنے صدیوں پرانے مذہبی عقائد اور رسم و رواج پر قائم تھے۔ اور اپنی ہی دنیا میں مگن حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایسے میں ہزاروں میل دورا جمیر میں بیٹھے ہوئے ایک مردِ خدا۔ جن کی باطن کی آنکھیں روشن تھیں، تار گئے کہ ان پہاڑوں میں گھبرے ہوئے انسانوں کو رہبری اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اپنے مرشد کامل حضرت شیخ سالارِ رومی کی ہدایت پر سید علی ترمذی پیر بابا علیہ الرحمۃ پہلے پشاور میں اور پھر کوہستان بونیر و یوسف زئی پہنچے۔ انہوں نے عرصہ دراز تک انتہائی خلوص ابے غرضی اور ایثار سے ان علاقوں میں دین اسلام کے فزوغ و اشاعت کے لئے کام کیا اور بالآخر سارے صوبہ سرحد، قبائلی اور کوہستانی علاقوں، گلگت، چلاس اور افغانستان کے مصلحِ اعظم کہلائے اور غوثیت اور قطبیت کے بلند مقام تک پہنچے۔ آج تک ان کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

حضرت پیر بابا اگرچہ عالم فاضل انسان تھے، جامع شریعت و طریقت تھے، بڑے بڑے علماء سے ان کے مناظرے اور مجادلے ہوتے رہے، اس لئے مگان غالب ہے کہ ان کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں بھی ضرور ہوں گی۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی کتاب اب تک دستیاب نہیں۔ اس سلسلے میں ان کے جانشینوں میں ایک صاحبِ کمال شخص سید عبدالجبار شاہ آف ستھاتہ نے بڑی جستجو کی، وہ سارے کوہستانی علاقوں میں پھیرے، افغانستان کے مقام قندز تک گئے، کونٹر میں پیر بابا



کے جانشینوں تک پہنچے مگر پیر بابا کی کوئی تصنیف ان کے ہاتھ نہ آسکی۔ بہر حال سید عبدالحبار شاہ نے اتنا ضرور کیا کہ پیر بابا کے بارے میں جو جو مصدقہ حالات مل سکے انہیں اپنی خود نوشت بعنوان "عبرۃ لا ولی الا البصائر" کی صورت مرتب اور مدون کر دیا۔ شاہ صاحب مرحوم کو حالات نے اجازت نہ دی کہ فراغت سے بیٹھتے اور ان جمع شدہ معلومات سے فائدہ اٹھاتے، تاہم انہوں نے ایک بنیاد فراہم کر دی ہے۔ اور یہی ان کا مقصد تھا، اس بارے میں لکھتے ہیں:-

”جو معلومات میرے ذہن میں ہیں انہیں ترتیب دے دینا ہی بہتر ہے، اگر زندگی میں مجھے خود موقع ملا تو خود ان کی نوک پلک سنوار لوں گا۔ ورنہ میری اولاد میں سے جس کسی کو توفیق ملی یا کسی اور مرد صالح نے چاہا تو اس ملبہ اور خام مواد کو کام میں لاکر اس سے تاریخ سرحد کی عمارت کھڑی کر سکے گا۔“

صوبہ سرحد اور قبائل کی تاریخ سے قطع نظر جہاں تک سید علی ترمذی پیر بابا علیہ الرحمۃ کی حیات تعلیمات کا تعلق ہے، سید عبدالحبار شاہ نے بھی زیادہ تر حضرت اخون درویزہؒ ہی کی تحریروں پر انحصار کیا ہے اور بات ہے بھی یہی کہ اخون درویزہؒ ایک فاضل بزرگ تھے، وہ برسوں تک اپنے مُشد گرامی۔ حضرت پیر بابا کے ساتھ سایہ کی طرح رہے، وہ ان کے ماذون اور خلیفہ بھی تھے اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے والے بھی۔ انہوں نے پیر بابا سے جو باتیں سُنیں، انہیں احاطہ تحریر میں لے آئے۔ ان اوراق میں بھی اخون درویزہؒ باباؒ کی تحریروں کو سند سمجھتے ہوئے انہیں بنیاد بنایا گیا ہے۔

## نام و نسب

حضرت پیر بابا افغانستان کے علاقہ کنٹر کے مقام قندز یا قندوز کے ایک نامور حسینی سادات گھرانے کے فرد تھے، سادات کا یہ گھرانہ

ہر دور میں سارے افغانستان، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ کابل کے حکمران اس خاندان کے نہ صرف ارادت مند رہے بلکہ اپنی بیٹیاں اس خاندان میں بیاہنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے رہے۔ اخون درویزہؒ نے ارشاد الطالبین میں اس ترمذی خاندان کا شجرہ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی پشتوں تک اس نامور خانوادہ

کے لوگ روحانیت کی دنیا میں انتہائی بلند مقام پر فائز رہے، درویشی اور امارت اس گھرانے میں ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ دینی اور دنیوی دجاہت دونوں میں ان کو حصہ ملا۔ یہ لوگ زیب محراب و منبر بھی رہے۔ اور صاحبانِ شمشیر و علم بھی۔ اس سلسلے کے افراد ملک کی وزارت پر بھی فائز رہے اور مشہور مجاہد حضرت نجم الدین بڈہ ملا صاحب کے جانشین بھی۔

سید علی ترمذی نے اسی عظیم المرتبت خاندان میں ۹۰۸ ہجری (۱۵۰۲ء) ولادت پائی۔ ان کے والد ماجد کا نام حضرت قنبر علی تھا جن کا مزار آج بھی خواجہ غلطان نامی مقام پر ہے جو قندز اور چار درہ کے نواح میں مرجع خاص و عام ہے۔ تاریخ کی پرانی کتابوں میں اس گاؤں کا نام "ترمذ" بیان ہوا ہے۔

سید قنبر علی کے بارے میں پیر بابا، سید علی ترمذی کا اپنا بیان ہے کہ "میرے والد بزرگوار سلطانین وقت کے مقربین میں شمار ہوتے تھے (سید عبد الجبار شاہ کے مطابق سید علی ترمذی سلطان ظہیر الدین بابر کے خواہر زادہ تھے) ان کا رجحان دربار داری اور امور مملکت کی طرف زیادہ تھا۔ وہ مغلیہ حکومت میں اہم منصب پر فائز تھے اور انہیں "امیر نظر بہادر" کا خطاب دیا گیا تھا۔ البتہ میرے جد امجد (دادا) حضرت امام المسلمین تید الدین الدین سید احمد نور اپنے آبا و اجداد کے پسندیدہ طریقے پر سلسلہ کبریہ سجادہ نشین تھے۔ اور اپنی دینداری اور پرہیزگاری کی بدولت سارے علاقہ میں بڑی عزت سے دیکھے جاتے تھے۔

سید علی ترمذی بچپن سے دنیوی امور سے بے نیاز تھے۔ اور ہر

ابتدائی تعلیم و تربیت | وقت کسی گہری سوچ میں پڑے رہتے تھے۔ کھیل کود اور ہنسی مذاق سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گھرانے کے لوگ پیار سے انہیں "دیوانہ" کہا کرتے تھے۔ تاہم چونکہ ان کا رجحان زہد و ریاضت کی طرف تھا۔ اس لئے ان کے دادا سید احمد نور ان پر خاص شفقت فرمایا کرتے تھے۔ جب گھرانے کا کوئی فرد سید علی ترمذی کو "دیوانہ" کہتا تو وہ فوراً اسے ٹوک دیتے اور فرمایا کرتے تھے۔ "تم دنیا دار اس دیوانے کی قدر و منزلت کیا جانو۔ اس کی قدر و قیمت مجھ سے پوچھو۔"

سید علی ترمذی بھی شروع سے اپنے دادا جان سے مانوس تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم

بھی انہیں سے حاصل کی اور ”شرح ملاحامی“ تک کی کتابیں انہیں سے پڑھیں۔ دادا اُن پر خصوصی توجہ مبذول فرماتے۔ خود سید علی ترمذی کا کہنا ہے کہ ”میرے قلب میں ابتداً زہد و ریاضت کا چراغ میرے اہل نظر و ادا جان کی توجہ سے روشن ہوا۔“

سلسلہ کبریہ میں اجازت

پیر بابا مزید لکھتے ہیں کہ ”جب میرے جد بزرگوار کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے مجھے بلایا اور فرمایا

میرے بیٹے! قرآن مجید میں سے جو کچھ تمہیں یاد ہو، پڑھو۔ میں نے سورۃ تبارک الذی کی تلاوت کی۔ فرمایا کہ پھر پڑھو۔ میں نے پھر وہی سورت پڑھی۔ فرمایا کہ پھر پڑھو۔ میں نے پھر وہی سورت پڑھی۔ پھر فرمایا کہ میرے بیٹے! وہ تمام برکتیں، نعمتیں اور سعادتیں جو مجھے حاصل تھیں اور ان میں سے بعض میں نے اپنے آبا و اجداد سے حاصل کی تھیں وہ سب میں نے تم کو بخشیں۔“

پیر بابا فرمایا کرتے تھے کہ ”فقیر کو سلسلہ کبریہ کا اذن اسی عمر میں اپنے عظیم و ادا جان کی زبان مبارک اور بیعت سے حاصل ہے۔“

دادا جان کی وفات کے بعد پیر بابا اپنے آپ کو نیک و تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتے تھے ان پر وحشت کا عالم طاری رہتا۔ ہر وقت وہ گم سم نظر آتے۔ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے دل اُچاٹ رہتا۔ کھانے پینے اور کام کاج میں دل نہ لگتا۔ روحانی طور پر بھی بڑی بے کیفی کا سماں تھا۔ اور وظائف بھی بیکسوئی اور دلجمعی سے ادا نہ ہوتے تھے۔

شاہی دربار میں

سید علی (پیر بابا) بیان کرتے ہیں کہ ”والد صاحب ہر کوشش کرتے کہ میرا دل بہل جائے کبھی کبھی وہ مجھے شاہانہ لباس پہنا کر اپنے

ساتھ بارگاہ سلطانی میں لے جاتے لیکن میرا یہ حال تھا کہ عمدہ لباس مجھے کاٹنے کو دوڑتا۔ جی چاہتا اسے نوچ کر پھینک دوں۔ جو نہی میں دربار سے واپس آتا فقیرانہ لباس پہن کر صوفیاء و اقیاء اور علماء کی مجلسوں میں بیٹھا جس سے میری طبیعت میں شاشت آتی کہ میرا طبعی رجحان اُسی طرف تھا۔

انہی دنوں سلطان ظہیر الدین بابر نے فتح ہندوستان کے ارادے سے لشکر کشی کا فیصلہ کیا، ہر

جنگ کے مجاہد اس کے پرچم تلے جمع ہونے لگے، باہر نے اپنے ولی عہد نصیر الدین ہمایوں کو ہمارے علاقے میں بھیجا کہ لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرے۔ میرے والد مجھے بھی اپنے ساتھ سلطانی لشکر میں لے گئے۔ پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کا آنا سامنا ہوا۔ اللہ نے سلطان ظہیر الدین بابر کو کامیابی سے نوازا اور اس نے دہلی میں مستقل حکومت کی بنیاد رکھی۔ جب میں نے سلطنت کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتے دیکھا تو دنیا کی ناپائیداری کا نقش دل پر مزید گہرا ہو گیا۔

حضرت پیر بابا کا کہنا ہے "ایک دن میں نے سپاہی اردوی میں پانی پت کے حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر کے مزار

### پانی پت میں قلندر کے حضور

مقدس پر حاضری دی۔ اپنا اسلحہ اور سامان اپنے اردلی کے حوالے کر کے جو نہی میں مزار پر مراقب ہوا۔ حضرت شیخ کے انوار و برکات کا نزول میرے دل پر ہونے لگا۔ کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں نے ترک دنیا کی ٹھان لی اور مزار کے پھلے دروازے سے نکل کر کسی نامعلوم دیرانے کو نکل گیا اور وہیں حق تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہو گیا۔ میرے والد ماجد اور ساتھیوں نے مجھے بہتیرا ڈھونڈا لیکن میں مل نہ سکا آخر کار وہ سمجھ گئے کہ یہ دنیا سے تو پہلے متنفر تھا، کہیں بھاگ گیا ہوگا

شیخ سیلونہ کی خدمت میں والد کے دل کو چین کہاں تھا۔ انہوں نے تلاش جاری رکھی اور آخر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میں اس وقت ایک دیرانے میں

اللہ سے لو لگائے بیٹھا تھا۔ والد کو دیکھتے ہی قدموں میں گر گیا اور ان سے اجازت مانگی کہ طلب حق کی راہ میں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ والد نے مجھے روکنے کی خاطر بہت سی نصیحتیں کیں لیکن میرا دل تھا کہ کوئی نصیحت قبول نہ کرتا تھا۔ مایوس ہو کر والد نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر بھی باپ تھے ازراہ شفقت مجھے کچھ اشرافیاں دے کر فرمایا۔ "یہ تمہارے سفر کا توشہ ہے" میں نے رقم لینے سے انکار کیا اور عرض کی "اباجان! اسے رہنے ہی دیکھتے، البتہ مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ جب میں طلب حق کے لئے جا رہا ہوں تو اپنی روزی بھی حق تعالیٰ ہی سے طلب کروں گا۔ اگر مجھے روپے کی طلب اور چاہت ہوتی تو شاہی دربار سے کیوں بھاگتا۔"

حضرت پیر بابا کا کہنا ہے۔ "جگہ جگہ پھرتا پھرتا میں مانک پور (نزد الہ آباد) پہنچا اور حضرت شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین جو پوری قدس سرہ کے خلفاء میں سے مخدوم زمان، کہف الامان، مائٹی بدعت، محی السنّت و شریعت شیخ سیلوٰۃ علیہ الرحمۃ والغفران کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرا شوقِ طلب و بیکہ کر وہ انتہائی شفقت سے پیش آئے اور میں ان کی خدمت میں رہ کر علم دین حاصل کرنے لگا۔ یہاں تک کہ فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" تک میں نے اپنی تعلیم پہنچائی۔"

پیر بابا شیخ سیلوٰۃ کے علمی تجربہ، غیر معمولی تقویٰ اور زہد و ریاضت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ "حضرت موصوف کا طین اولیاء اللہ سے تھے۔ سخت پابند شریعت و سنت تھے۔ ان کی کرامات بیان سے باہر تھیں۔ ایک بار انہوں نے وعظ کرتے ہوئے کہا۔ "صوفی وہ ہے جو فنا فی اللہ تک پہنچ جائے اللہ تعالیٰ سے دل لگائے اور اُس کا حال یہ ہو کہ یاد الہی سے کسی حال میں بھی غافل نہ ہو سکے۔" کسی کے سوال پر یا خود ہی تحدیثِ نعمت کے طور پر وہ یہ بھی کہہ گئے۔ "الحمد للہ! یہ کیفیت مجھے حاصل ہے" پیر بابا کہتے ہیں۔ "مجھے اس بات کا یقین نہ لگتا تھا کہ انسان پر ایسی کیفیت بھی طاری ہو سکتی ہے۔" ایک دن بھری مجلس میں آپ وعظ و نصیحت کر رہے تھے، آپ کا ذہن اور زبان دونوں مصروف تھے۔ میں نے سوچا۔ "کیا اس وقت بھی حضرت یاد الہی میں مصروف ہیں؟" میں یوں بھی حضرت سے کافی فاصلے پر تھا، لیکن میرے دل میں خیال آتے ہی حضرت باتیں کرتے کرتے اچانک رک گئے اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے۔ "ستید علی! میں اس وقت بھی ذکر الہی سے غافل نہیں ہوں۔" یہ سن کر میں دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا۔

پیر بابا کہتے ہیں، میں نے کئی اور موقعوں پر بھی آزمایا ہے۔ حضرت (شیخ سیلوٰۃ) ہمیشہ توجہ الی اللہ ہوتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب حضرت شیخ سیلوٰۃ کے پاس کافی عرصہ گزر گیا تو میں نے التجا کی مجھے طریقت کے رموز سے بھی سرفراز فرمایا جائے۔ "تب انہوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد فرمایا۔ "یہ کام سرسری نہیں، اس میں دستیگیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی متعین ہے کہ کس کو کہاں سے فیض ملے گا۔ تم ہمارا سفارشی خط لے کر اجیر شریف چلے جاؤ۔ وہاں ہمارے ایک پیر سبانی ولی کامل اس

منصب کے اہل ہیں۔ تمہیں وہاں سے فیض ملے گا۔“

شیخ سالار عطاء اللہ رومی حضور کے  
پیر بابا کہتے ہیں۔ ”میں شیخ کا خط لے کر طویل مسافت طے  
کر کے شیخ الاسلام و المسلمین، سید الدین والدین شیخ سالار

عطاء اللہ رومی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے خط پڑھ کر میرا حال احوال پوچھنے کے بعد فرمایا  
”اے سید ایوں تو سادات صحیح النسب اور صحیح العقائد سب کے مخدوم ہوتے ہیں تاہم تمہارا مقصد  
خدمت سے حاصل ہوگا اور تمہیں پیر کامل کے حضور حاضر رہنا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے  
مصلیٰ برواری کی خدمت سپرد فرمادی۔ میں نے پوری تندہی سے اس خدمت کو نبھایا، حضرت نے  
میرے مزید خدمت کو دیکھ کر سلوک و تصوف کے سبق شروع کرائے۔ جو سبق مجھے ملتا میں ہفتوں  
اس کی مشق کرتا، جب اللہ کی مہربانی سے اُس کی حقیقت کو پہنچ جاتا تو حاضر ہو کر حضرت کو حقیقت حال  
سے آگاہ کرتا جس پر وہ مسرور ہو کر اگلا سبق عطا فرماتے۔ ایک طویل مدت تک یہ سلسلہ جاری  
رہا۔ بالآخر انہوں نے مجھے انعاماتِ باطنی سے نوازا اور اپنا ماؤن و مجاز مقرر فرمایا۔ اب  
حضرت نے مجھے ارشاد و ہدایت کی اجازت تو دے دی لیکن مجھے تو شروع ہی سے طبعاً اختلاطِ خلعت  
سے کد تھی۔ میں زاویہ نشینی اور خلوت گزینی کی عادت بنا چکا تھا۔ اس لئے حضرت سے عرض کیا کہ  
”میں ارشاد و تبلیغ کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔“ لیکن حضرت نے سمجھایا کہ دینے والا انت  
الہیہ کی نعمت یونہی عطا نہیں کرتا بلکہ یہ نعمت اُسی کو دیتا ہے جو اس کا اہل ہو۔“ اس پر تعمیل و ارشاد  
کے بغیر چارہ نظر نہ آیا اور مرشد کے حکم کی بجا آوری شروع کر دی۔

حضرت پیر بابا بتاتے ہیں کہ ارشاد و تبلیغ کے رستے میں بہت سے موانعات ہیں، بعض اوقات  
شیخ کی شہرت اس میں کبر نفس پیدا کرتی ہے کبھی وہ اپنے آپ کو خدا رسیدہ اور کامل سمجھ بیٹھتا ہے  
جس سے اس کی مزید ترقی رک جاتی ہے۔ اسی طرح اور آزمائشیں بھی ہیں اگر توفیق خداوندی سے  
بندہ ان موانعات سے بچ کر ثابت قدمی کا ثبوت دے تو اللہ تعالیٰ کا ولی کہلانے کا حقدار بن  
سکتا ہے۔

پیر بابا نے سالک کے لئے ایسی رکاوٹوں کی تعداد ۷۷ بتائی ہے  
اللہ نے مدد فرمائی اور پیر بابا خلقِ خدا سے ملنے جلنے لگے اور لوگ بھی بڑی تعداد میں ان کی  
طرف رجوع کرنے لگے۔ انہی طالبانِ ہدایت میں ملک گدائی اور حاجی سیف اللہ گلیانی بھی تھے جو  
ہمایون کی فوج میں سزدار تھے اور علاقہ پشاور کے رہنے والے تھے جب ہمایون کو شیر شاہ سوری  
کے ہاتھوں شکست ہوئی تو یہ لوگ پریشان حالی میں اپنے وطن واپس جا رہے تھے۔

کوہستان میں تعیناتی | اپنے مُرشد سے رخصت کی اجازت لینے سے پہلے پھر  
پیر بابا نے بتایا کہ "میں طبعاً تنہائی پسند ہوں اور ہجوم

خلائق سے بھاگتا ہوں۔ میں تو صرف اپنا تزکیہ نفس چاہتا ہوں اس پر حضرت سالار روٹی نے انہیں  
ہدایت کی وہ کوہستان چلے جائیں اور خلقِ خدا کو فائدہ پہنچائیں۔

مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں پیر بابا سید علی ترمذی عازم پشاور ہوئے۔ دورانِ سفر جب وہ  
گجرات پنجاب کے نواحی گاؤں داؤد پنڈ میں وارد ہوئے تو انہیں دیکھتے ہی ایک شخص نے جس کا نام  
کیلاس تھا۔ شور مچا دیا کہ "اے لوگو! دوڑو! اس شخص کو میں نے خواب میں دیکھا تھا اور وہ  
خواب تم سب کو سنا بھی چکا ہوں، وہ یہی شخص (پیر بابا) ہے۔" اسے اپنا پیر و مرشد بناؤ۔  
ہماری نجات کا سامان اسی کے پاس ہے۔" دیکھتے دیکھتے لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ اس پر میں نے اُس  
شخص کے دعوے کی تردید کی اور اس کے دعوے کا ثبوت مانگا۔ اس پر سبھی لوگوں نے گواہی دی  
کہ اس شخص نے اس سلسلے میں جو خواب دیکھا تھا اور خواب میں جس علیہ کے شخص کو دیکھا تھا۔ وہ  
آپ ہی ہیں۔

پیر بابا کہتے ہیں۔ "تب میں نے ان سب لوگوں کو مرید شریعت بنا کر ان سے امر بالمعروف  
اور نہی عن المنکر کی بیعت لی۔ کچھ عرصہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے مجھے اسی جگہ ٹھہرنا پڑا  
اور لوگوں نے مجھے اپنا پیر یا پیشوا مان لیا۔

والد صاحب دوبارہ ملاقات | یہ وہ زمانہ تھا جب شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شہنشاہ

ہالیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہمایوں خود سندھ اور بلوچستان کے راستے ایران چلا گیا تھا۔ جبکہ شکست خوردہ لشکر کے افغان اور سرحدی سپاہی اپنے اپنے وطن کی جانب روانہ تھے۔ پیر بابا ابھی گجرات کے مقام داو پندھی میں تھے کہ ان کی ملاقات اپنے والد ماجد سے ہوئی جو وطن واپس جا رہے تھے۔ والد نے پیر بابا کو فرط محبت سے گلے لگایا اور کہا۔ "ہم تو دنیا اور اس کے جھمیلوں ہی میں پھنسے رہے جہاں کبھی فتح ہے کبھی شکست۔ تم نے اچھا کیا کہ وہ راستہ اختیار کیا جو سیدھا اور حق کا راستہ ہے۔" والد رخصت ہونے لگے تو انہوں نے اشرفیوں اور روپوں کے ڈو توڑے پیر بابا کو پیش کئے پیر بابا نے یہ کہہ کر رقم واپس کر دی کہ۔ "یہ میرے کام آنے والی چیز نہیں۔" تاہم اس خیال سے کہ والد کا دل نہ دکھے۔ رقم ان سے لے کر فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی۔ اس کے بعد پیر بابا کے والد سید قنبر علی عازم وطن ہو گئے۔

جب پیر بابا کے والد ماجد ان سے رخصت ہو کر اپنے وطن کو چل دیئے تو پیر بابا پر بڑی اداسی کی کیفیت چھا گئی۔ اپنے مرشد کے دیدار کی تمنا پھر جاگ پڑی اور وہ اجمیر شریف کی طرف چل پڑے۔ اب کے ان کا یہ ارادہ بھی تھا کہ اپنے مرشد کی اجازت سے اپنے آپ کو خلق خدا کی تبلیغ و ہدایت کی ذمہ داری سے آزاد کرالیں کیونکہ وہ بیکہ تنہا یاد الہی میں مصروف رہنے کو بہتر سمجھتے تھے۔ اور مجرم خلائق کو پسند نہ کرتے تھے۔ تاہم پیر بابا تو پیری مریدی کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر اجمیر جا رہے تھے۔ جبکہ تقدیر ان پر خداں تھی کیونکہ جب وہ اجمیر پہنچے تو یہ سن کر دل تمام کر رہ گئے کہ حضرت سالار عطاء اللہ دہلی کا انتقال ہو چکا ہے۔ پھر جب شیخ سالار دہلی کے صاحبزادے حضرت شیخ حسین سے تعزیت کی خاطر ان کے گھر گئے تو انہیں مراقبے میں مصروف پایا۔ انہوں نے تھوڑی دیر بعد مراقبے سے سراٹھایا، فاتحہ پڑھی اور پیر بابا سید علی ترمذی سے یوں مخاطب ہوئے۔ "اے سید علی! ابھی میں نے شاہدے میں والد بزرگوار (سالار دہلی) کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میرے ڈو خرقے ہیں۔ ایک کو بھاڑ کر میرے عام مردوں میں تقسیم کر دو اور دوسرے کو اس شخص کو پہنا دو جو دور دراز سے سفر کر کے ابھی



ابھی تمہارے پاس پہنچے گا۔ وہ شخص یقیناً صراطِ مستقیم پر ہے اور لوگوں کو رشد و ہدایت سے مشرف کر سکتا ہے۔ چونکہ میں آپ میں وہ سب مطلوبہ علامتیں موجود پاتا ہوں جن کا ذکر والد صاحب (شیخ سالار رومی) نے مجھ سے کیا ہے۔ لہذا میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں کیونکہ اس پر آپ کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔“

پیر بابا حضرت سید علی ترمذی نے وہ خرقہ پہن لیا۔ وہ اجیر گئے تو اس لئے تھے کہ رشد و ہدایت کی پابندیوں سے آزادی حاصل کر لیں گے لیکن خرقہ پہننے اور سالار عطا اللہ رومی کے ماذون بن جانے کے بعد اس کی ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

پیر بابا کچھ عرصہ تک حضرت شیخ حسین کے پاس اجیر میں ٹھہرے۔ اس دوران انہوں نے ان کی نواضع اور مہانداری میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، بالآخر جب حضرت پیر بابا نے اپنے مرشد زادہ سے رخصت کی اجازت چاہی تو حضرت شیخ نے انہیں تاکید کیا کہ ”والد محترم نے فرمایا تھا کہ جب آپ آئیں تو میں آپ کو ان کا پیغام پہنچا دوں کہ آپ کو ہستان چلے جائیں جہاں تبلیغ اسلام کی اشد ضرورت ہے۔“

اجیر سے روانہ ہو کر جگہ جگہ ٹھہرتے جب پشاور پہنچے جب ان کے مخلص **وردیشاؤ** مریدوں حاجی سیف اللہ گلگانی اور ملک کدوائی کو ان کے آنے کی خبر ملی، وہ بڑی منت سماجت سے پیر بابا کو اپنے ہاں دوآبہ لے گئے۔ انہیں دیکھتے ہی علاقہ بھر کے عوام ان کی زیارت کے لئے آئے اور بعض نے ان سے بیعت طریقت کر لی اور بعض نے بیعت شریعت۔ ایک سال تک حضرت پیر بابا کا قیام دوآبہ میں رہا۔ ایک سال کے بعد جب پیر بابا نے اپنے وطن قندز جانا چاہا تو سارے علاقے کے لوگ جرگہ لے کر آئے اور عرض کی کہ

”آپ کی تشریف آوری سے اس علاقے کے ہزاروں مسلمانوں نے تو بہت فیض پایا ہے۔ تاہم نواحی علاقہ یوسف زئی میں بھی آپ کے تشریف لے جانے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ وہاں سلحد اور جھوٹے مدعیان ولایت کا بڑا زور ہے۔ اور وہ اپنی دنیوی

اغراض کی خاطر لوگوں کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کذاب لوگوں سے عوام کو نجات دلاتا ضروری ہے۔“

حضرت پیر بابا اپنی اسلامی اور تبلیغی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے یوسف زئی کے علاقے میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں

**سزین یوسف زئی میں آمد**

کے عوام نہایت سادہ دل اور اسلام کے شیدائی ہیں، وہ اللہ اور رسول کے نام پر ہر قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان کے جوان بوڑھوں سے بھی بڑھ کر دیندار ہیں اور عورتیں دینی امور کی مردوں سے بھی زیادہ پابند ہیں، یہاں تک کہ بچے بھی اسلام سے محبت کرتے والے ہیں۔ مگر ایک تو دینی تعلیم کے فقدان کے باعث اور دوسرے علماء حق کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود غرض اور جعلی پیروں کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ پیر بابا نے ان بد عقیدہ "پیروں" کے پھیلنے ہوئے غلط خیالات کا سدبآ کیا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

حضرت پیر بابا نے کچھ عرصہ سزین یوسف زئی کے مشہور قصبہ سدوم میں قیام فرمایا۔ لوگ جوق در جوق ان کی خدمت میں آتے اور فیض

**سدوم میں قیام اور ازواج**

پاتے رہے۔ ان لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ایسے لوگوں سے جن سے ان کو عقیدت ہو، اپنے وطن میں مستقلاً ٹھہرانے کے لئے یہ تدبیر کرتے کہ کسی سرکردہ قبیلہ کا سردار یا خان اپنی بیٹی یا بہن کا عقد اس سے کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اہل بونیر کے ایک نامور سردار ملک دولت خان ملینرئی (بارک شاہ زئی) نے اپنی ہمشیرہ بی بی مریم پیر بابا کے عقد میں دے دی۔ اگرچہ پیر بابا اس سلسلے میں پہلے انکار کرتے رہے لیکن ہزاروں عوام کا اصرار ان کے انکار پر غالب رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نیک و نعت خاتون سے آپ کو اولاد عطا کی۔ اور اس طرح پیر بابا نے مستقلاً کوہستان یوسف زئی کو اپنا وطن بنا لیا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت پیر بابا کے دل میں اپنے وطن عزیز کو دیکھنے اور والد محترم سے ملاقات

**والد محترم سے ملاقات**

والدین سے ملاقات کرنے کی تمنائے انگریزی لی۔ چنانچہ انہوں

نے اپنے اہل خانہ کو تو سدوم ہی میں رہنے دیا اور خود ان سے اجازت لے کر نہ پہنچے۔ وہاں پہنچنے پر آپ کو پتہ چلا کہ آپ کے والد محترم اس دارِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں البتہ والدہ کے دیدار سے فرحت پائی۔ والدہ ماجدہ کو جب معلوم ہوا کہ سید علی غوامس (پیر بابا) سدوم میں شادی کر چکے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کو وہاں چھوڑ کر ان سے ملاقات کو آئے ہیں تو انہیں اجازت دی بلکہ ہدایت کی کہ وہ واپس سدوم جائیں اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

**پاچا کلی میں آمد** | سدوم سے نقل مکانی کر کے حضرت پیر بابا نے بالآخر بونیر کے مقام پاچا کلی کو اپنا مستقل مستقر بنایا۔ وہ اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ اور ان کی آخری

آرام گاہ بھی وہیں ہے۔ یہ مقام ایک پہاڑی ندی کے کنارے بڑے پرنفعا ماحول میں پہاڑوں کے گود میں واقع ہے۔ مزار پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے جس کے ساتھ ہی ایک وسیع جامع مسجد بھی ہے جو جدید فن تحریر کا شاہکار ہے۔ مزار سے تھوڑے فاصلہ پر ایک پہاڑی غار ہے جس کے بار میں کہا جاتا ہے کہ حضرت پیر بابا وہاں مراقبہ فرماتے اور چلے کھاتے تھے۔

حضرت سید علی ترمذی (پیر بابا) علیہ الرحمۃ نے سال ۹۹۱ ہجری (۱۵۸۳ء) میں اس دنیا فانی سے دارِ آخرت کو سفر فرمایا۔ ان کا مزار آج تک مرجع خاص و عام ہے۔ صوبہ سرحد قبائلی علاقوں، افغانستان اور شمالی پنجاب سے ہر روز ہزاروں لوگ حضرت پیر بابا کے ہاں حاضری دیتے، رات بھر ملحقہ مسجد میں نفل ادا کرتے، مراقبہ ہوتے اور دعاؤں میں مصروف رہتے ہیں۔ سالانہ عرس پر تو زائرین کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچتی ہے۔

مزار پر ننگر کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ایک دینی مدرسہ بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ جہاں دُور نزدیک کے طلباء آتے اور دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

حضرت سید علی ترمذی (پیر بابا) کی وفات کے بعد شاہانِ وقت نے ایک بڑی ریاست کو نٹر کے علاوہ تختہ بند (بونیر) کے صاحبِ سجادہ و دستار کے لئے چوبیس ہزار روپہ سالانہ کا عطیہ دیا بھی منظور کیا تھا۔

حضرت پیر باباؒ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شہنشاہ اکبر نے یوسف زئی کے خلاف فوجی مہم بھیجی۔ پہلی بار وردہ کوڑا کوڑ میں مغل فوجوں کو سخت رسوائی کا سامنا ہوا تاہم دوبارہ مغلوں نے میدانی علاقوں کی تاخت و تاراج شروع کی تو لوگوں نے جان لیا کہ حضرت پیر باباؒ جیسی مہتمی کے اٹھ جانے کے بعد اب ان کی آزمائشوں کا دور شروع ہو گیا۔ بعض لوگوں نے بایزید انصاری کے ساتھ خونین معرکوں اور خانہ جنگی کو بھی عذاب سے تعبیر کیا ہے۔

پیر باباؒ سید علی ترمذی علیہ الرحمۃ کی رحلت کے بعد ان کے جانشینوں، اولاد اور ارادت مندوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور سارے کوہستانی علاقوں، کاناں، کشمیر، گلگت، پچھلی کافرستان اور چترال کے لوگ ان کی تبلیغی مہم کی بدولت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

## افکار و نظریات

حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا خود ایک عالم باعمل تھے۔ اس لئے دوسروں کو بھی علم و عمل کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں باطنی استعداد کے ساتھ ساتھ نفس انسانی کا گہرا شعور بھی عطا فرمایا تھا۔ وہ انسانی فطرت اور نفسیات سے کما حقہ آگاہی رکھتے تھے اس لئے ایک مشفق اور ماہر معلم کی طرح شاگردوں اور مریدوں کو ان کے حسبِ تعلیم دیا کرتے تھے، چونکہ وہ ایک صوفی کامل تھے اس لئے ظاہری پندارِ علم کا سایہ تک ان پر پڑنے نہ پایا تھا۔ ان کا طریق طریقِ محبت تھا، ان کے دروازے بھی پر کھلے تھے۔ جو کوئی چاہتا ہے جھجک ان کے پاس حاضر ہوتا۔ اپنے مسائل اور اپنی مشکلات بیان کرتا۔ وہ اُسے حل کرتے، کوئی علمی نکتہ اٹھاتا تو اُسے بڑی ملامت اور نرمی سے اس کے بارے میں بتاتے۔ ان کی نظر آفاقی اور وسیع تھی۔ اس لئے وہ گروہی اور اخلاقی امور سے بالاتر رہتے اور ہر آنے والے سے اُس کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرتے۔ ہر دکھیا کے زخم پر مرہم رکھتے، ہر انسان سے ہمدوانہ طور پر پیش آتے۔ زبانِ تنگ نظر کے برعکس صوفیائے کرام ہر کسی کو گلے لگاتے ہیں، وہ گناہ سے نفرت کرتے ہیں لیکن گناہ کار کو دھتکارنے والے نہیں ہوتے بلکہ ان کا مقصد ہر انسان کی راہنمائی اور اصلاح ہوتا ہے۔ وہ ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والے ہوتے ہیں۔ بقول کے

e دل شکستہ در آن کو چہ می کنند درست ؟ چنان کہ خود نشاند کہ از کجا بشکت

ان کے نزدیک طریقت اور شریعت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہوتے ہیں، البتہ وہ پہلے

دلوں کی اصلاح کرتے ہیں۔ دل خلوص آشنا ہو جائے تو اعمال ظاہری میں سوز و گداز اور حسن نیت کا پیدا ہونا ضروری ہے، دل اللہ پاک کی یاد سے معمور ہو جائے تو انسان کا کوئی فعل اللہ کی رضا کے خلاف سرزد ہونے نہیں پاتا۔

پیر بابا جیسے عالم فاضل کے بارے میں بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ضرر حساب تصنیف و تالیف ہوں گے، تاہم ان کے جانشینوں کو اتنی آزمائشوں، آویزشوں اور انقلابوں سے واسطہ پڑا کہ ان کی تحریریں محفوظ رہنے نہ پائیں۔ صرف وہی اقوال و احوال ہم تک پہنچے جن کا ذکر ان کے نامور جانشین علامہ انون درویزہ بابا نے اپنے عظیم مرشد کے بارے میں اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ پیر بابا علیہ الرحمۃ کے ان افکار و فرمودات سے ان کی حیات و تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے اور ہر سمجھدار اور غیر جانبدار قاری اس رفعت مقام کا اندازہ لگا سکتا ہے جس پر پیر بابا فائز تھے۔ یہ امر بھی دوستوں کے دلوں کو ٹھنڈک بخشنے اور مخالفوں کی آنکھیں کھولنے کا موجب ہے کہ پیر بابا کا نام اور مشن ابھی تک زندہ ہے، ان کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اور وہ آج بھی ان کے فرمودات سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ہم پیر بابا کے چیدہ چیدہ اقوال کو قارئین کے افادہ کے لئے پیش کر رہے ہیں۔

**پیر طریقت کیا ہو؟** لازم ہے کہ پیر طریقت وہ ہو جو جملہ احوال و اقوال میں سید المرسلین، رحمت للعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے طریق اور سنت سے ذرا بھر تجاوز نہ کرے اور جزوی اور کُلّی امور میں اتباع نبوی کو اپنا شعار بنائے۔

**خرق عادات یا کشف و حہ کمال نہیں ہے** ”کشف اس کو کہتے ہیں کہ عام لوگ جس چیز کو نہیں دیکھ سکتے

اہل اللہ کو اپنے باطن کی صفائی کی بدولت دل کی آنکھوں سے نظر آجاتی ہے۔ تاہم کشف و کرامت کسی دلی سے ظہور میں آتے ہیں کسی سے نہیں، اس لئے کشف و کرامت کو

معیار ولایت نہیں سمجھنا چاہیے۔

”علمائے حقانی، ہادیان قوم اور اولیائے کرام کو بڑا متحمل ہونا چاہیے  
 نہ وہ کسی سے انتقام لیں نہ مخالف عقیدہ رکھنے والوں پر غیظ و

**دلہشی کا حاصل**

غضب کا اظہار کریں۔ اُن کا کام خلقِ خدا کی ہدایت ہے، جہاں تک ہو سکے لوگوں  
 کی ہدایت کریں۔“

”مرید کو چاہیے کہ بغیر ذکر الہی یا عبادتِ خدا کے کسی دوسری بات  
 کی طرف التفات نہ کرے اور نہ عام لوگوں کی باتوں کی پرواہ کرے

**مرید کا فرض**

۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اُنت محمدؐ میں ایسے ایسے مردانِ  
 خدا گذرے ہیں اور موجود ہیں کہ انہوں نے بڑے درجات و مراتب حاصل کئے ہیں مگر ذرہ  
 بھر بھی کشف و کرامات اور اسرارِ الہی ظاہر نہ ہونے دیئے۔ اور یہ خیال تک نہ کیا کہ ہم کون  
 ہیں اور کیا ہیں؟۔۔۔ درویشی کی غایت یہ ہے کہ عبادت، ریاضت، زہد و تقویٰ اور  
 حسنِ اخلاق کو اپنا وظیفہٴ حیات سمجھا جائے۔“

حضرت پیر بابا ہر ایک سے نرمی اور ملائمت سے پیش آتے۔ کسی  
 کو سختی سے نہ ڈانٹتے بلکہ ایسے انداز میں اُسے سمجھاتے کہ

**سمجھا کا طریقہ**

وہ خود ہی اپنے خراب عقیدوں اور عادتوں سے باز آجائے۔

اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک بار حضرت پیر بابا  
 اور میں ایک ایسے امیر شخص کے گھر مہمان ہوئے جو بھنگ پیتا تھا اور عقیدہٴ تاسخ اور آداگون  
 کا قائل تھا۔ اُس کا باپ بھی اسی قسم کے عقائد رکھتا تھا۔ اور تازنگ میں آکر کبھی اپنے آپ کو  
 (نعوذ باللہ) علی المرتضیٰ کہتا تھا اور کبھی خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ مرتے وقت اُس نے بیٹے کو وصیت  
 کی کہ میری موت کے دس بارہ سال بعد تم بادشاہِ دہلی کے دربار میں آنا۔ وہاں میں شہزادے کے  
 طور پر نیا جنم لوں گا۔ اُس وقت میں دس بارہ سال کا ہو چکا ہوں گا۔ تم آؤ گے تو تمہیں پہچان

لوں گا۔ اور تم پر شاہانہ نوازشیں کروں گا۔ اُس شخص کو اپنے باپ کی اس " وصیت " پر اتنا یقین تھا کہ اُس نے بادشاہ کو تحفہ پیش کرنے کے لئے دو عمدہ گھوڑے بھی خرید رکھے تھے۔ اور وہی جانے کی تیاریاں کر چکا تھا۔

ہم سب لوگوں کو اُس بد عقیدہ شخص کی باتوں پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن حضرت پیر بابا بڑے تحمل سے اُس کی باتیں سنتے رہے۔ اور جب وہ اپنی باتیں پوری کر چکا تو اسے تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کی نصیحت پر ضرور عمل کرے۔ اور ضرور وہی جا کر بادشاہ سے ملاقات کرے۔ -

اخون درویزہ کہتے ہیں کہ جب ہم وہاں سے رخصت ہو کر دوسری جگہ گئے تو پیر بابا صاحب سے بڑے تعجب سے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا ہے۔ اُس بد عقیدہ شخص کو منع کرنے کی بجائے آپ نے اُسے تاکید کی ہے۔ کہ باپ کی وصیت کے مطابق ضرور وہی جاؤ اور بادشاہ سے ملاقات کرو۔ آخر آپ نے یہ کیوں کہا۔ ؟

حضرت پیر بابا نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مسلسل کئی سالوں تک اپنے باپ سے یہ غلط باتیں سنتا آیا ہے۔ اب یہ باطل عقیدہ اُس کے دماغ پر نقش ہو چکا ہے۔ اگر ہم صرف نصیحت سے اُسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے تو چنداں کامیابی نہ ہوتی۔ جب یہ شخص قیمتی گھوڑے اور دوسرے تحائف لے کر اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد وہی پہنچے گا تو اول تو بادشاہ کا کوئی بیٹا ہی اس بارہ سال کی عمر کا نہ ہوگا اور اگر ہوا بھی تو وہ اُسے کب پہچانے گا اور اسکی کیا خاطر مدارات کرے گا۔ بلکہ اُنہا سے پاگل سمجھ کر اور بے عزت کر کے دربار سے نکال دے گا۔ اس طرح اسے جو رسوائی اور مایوسی ہوگی اُس سے نہ صرف اُس کی آنکھیں کھل جائیں گی بلکہ جو بھی یہ واقعہ سُننے گا نا سُنخ اور ادا گوں کے باطل عقیدے کا مذاق اڑائے گا۔

**غفلت کی سزا** | اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت پیر بابا مسجد سے نکل کر گھر جا رہے تھے ان کے فرزند سید مصطفیٰ بھی جانماز کندھے پر ڈالے اُن کے ساتھ ساتھ تھے۔ جب وہ ایک تنگ کوچہ میں پہنچے تو سامنے سے دو



طاقنور بیل نمودار ہوئے اور آپس میں لڑنے لگے، یہاں تک کہ لڑتے لڑتے وہ حضرت صاحب پر آگرے جس سے اُن کا چہرہ لہو لہان ہو گیا اور کچھ دوسری چوٹیں بھی لگیں۔ گھر پہنچے تو بیٹے سے کہا۔

” آج مجھے پہلے ہی سے کسی آفت کے نازل ہونے کا ڈر تھا۔“ بیٹے نے پوچھا، وہ کیسے؟ حضرت نے کہا، ” وہ یوں کہ آج رات میں بیدار نہ ہو سکا اور نماز تہجد فوت ہو گئی جس پر مجھے سزا کا ملنا لازم تھا۔“

## خدائی امانت

اخون درویزہ کا کہنا ہے کہ ایک بار میرے استاد حاجی محمد صاحب المعروف بہ ملازنگی پاپنی نے شیخ معظم (حضرت پیر بابا) کے حضور میری بہت سفارش کی اور کہا کہ یہ (اخون درویزہ) فلاں باطنی شغل اور تلقین طریقت کا شوق رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کا اہل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر نگہ کرم کی جائے۔ لیکن حضرت مخدوم (پیر بابا) کی عادت تھی کہ اس بارے میں حد سے زیادہ احتیاط کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔ ” یہ خدائی امانت ہے اہل کے بغیر کسی اور کو اس کا سپرد کرنا خیانت کاری ہے۔ البتہ اس خدائی امانت کے اہل علماء اور اقیاء ہیں نہ کہ جاہل اور ناسمجھ لوگ۔“ اخون درویزہ کا کہنا ہے کہ بفضل تعالیٰ مجھے حضرت پیر بابا نے اس باطنی شغل کی اجازت مرحمت فرمادی۔“

حضرت پیر بابا نے اخون درویزہ بابا کو تاکید فرمائی کہ علم عارفِ کامل کی پہچان

تصوف (موافق شریعت) کے حصول میں پوری پوری

کوشش کرو۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے عارفِ کامل بن جاؤ۔ اپنا ایمان بھی سلامت لے جاؤ اور مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بھی ہلاکت و زوال سے بچا سکو۔ حضرت پیر بابا نے افسوس ظاہر کیا کہ کئی لوگ محض علم تصوف کی چند اصطلاحات سیکھ کر اسے بطور پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ بھلا دوسروں کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں۔“

## کمال تربیت

اخون درویزہ علیہ الرحمۃ بتاتے ہیں کہ ہمارے حضرت کی عادت مبارکہ تھی

کہ آپ طالبِ صادق کے ساتھ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر شفقت

اور محبت کا ہر تاؤ کرتے تھے۔ اور اس کو مقاماتِ عالیہ تک پہنچانے کی ہر ممکن سعی کرتے تھے۔

یہاں تک کہ وہ شخص درجہ کمال کو پہنچ جاتا تھا۔ پھر اُسے رخصت کر کے اُس کے علاقہ میں بھیج دیتے تو وہ سب اہل وطن کے لئے ایک نمونہ عمل ثابت ہوتا۔ حضرت سے تربیت یافتہ انہی لوگوں کی وجہ سے ان سارے علاقوں میں اسلام کی روشنی پھلتی گئی۔

## اتباع سنت

اخون درویزہ مزید لکھتے ہیں کہ میں کئی برس تک رات دن، سفر و حضر میں حضرت پیر بابا کی خدمت میں حاضر رہا۔ میں نے ان کی ہر حرکت، ہر عمل اور ہر ادا کو سنت نبوی کے عین مطابق پایا۔ اور ان کے ہر کام میں (جو سنت کے موافق ہوتا) برکات اور انوار کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ حضرت سے ماذون و مجاز ہونے کے بعد میں نے بھی اسی طریق کو اپنایا۔

لکھتے ہیں۔ — سالک کو فنِ تصوف میں تمام کوششیں محض رضائے الہی کے حصول کی خاطر کرنی لازم ہیں۔ کشف و کرامت کا شوق

اور آرزو رکھنا ضروری نہیں۔ عوارف المعارف میں ہے کہ اگر تصوف کے طالب کی نیت ابتدا ہی سے کشف و کرامت کے حصول کی ہو اور وہ خالصتاً رضائے الہی کا جویانہ ہو تو شیطان اُسے سیدھے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔

۷ یکن بیرون ز دل ہر ماسوارا ۷ بیابی آں زمان ستر خدا را

اخون درویزہ بابا کا کہنا ہے کہ ایک بار میں طویل عرصہ کے بعد حضرت پیر بابا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا۔

”اتنا عرصہ کہاں غائب رہے؟“ میں نے عرض کی ”کچھ عرصے سے تگ دست ہوں۔ خالی ہاتھ آپ کے پاس آتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ نہ آسکا۔“ فرمایا ”کتنے عجیب آدمی ہو! آنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کو نہیں دیکھتا، خلوص نیت کو دیکھتا ہے۔ میں تو صرف انہی لوگوں کو مخلص مرید سمجھتا ہوں جو مجھ سے روحانی فیض حاصل کرنے میرے پاس آتے ہیں۔ جو میرے پاس گائے، بیل، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ لے کر آتے ہیں۔ میں ان کے تحائف خدا کی طرف سے

سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ میرے خاص دوست اور مُرد نہیں ہوتے۔ بلکہ خدا کی طرف سے مجھے چیزیں پہنچانے پر مامور ہوتے ہیں۔“

”اخبار الاولیاء“ میں ہے کہ شیخ علی ترمذی (پیر بابا) جو سلسلہ چشتیہ صابریہ سے منسلک تھے سلسلہ چشتیہ کے رواج

### نصیحت قبول کرنا

کے مطابق سماع سنتے تھے حضرت اخون درویزہ نے اس پر اپنے مُرشد کو اس کے خلاف سنت ہونے کی طرف توجہ دلائی۔ اُن کے شیخ (پیر بابا) نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا ”بات یہ ہے، میں کبھی کبھی سماع اس لئے سنتا ہوں کہ سماع کی حالت میں بعض اسرار مجھ پر منکشف ہوتے ہیں۔ تاہم میں اسے ترک کرنے پر تیار ہوں۔ اُس کے بعد انہوں نے کبھی سماع نہیں سنا۔“

اخون درویزہ بابا بیان کرتے ہیں کہ ”میں اپنے شیخ (حضرت پیر بابا) سے اس طرح تعلیم حاصل کرتا تھا کہ ایک ہفتے تک خلوت اختیار

### طریقہ تعلیم

کر کے اُس پر غور و فکر کرتا اور بے پناہ ریاضت کے بعد جو کچھ میں محسوس کرتا اُسے اپنے شیخ کے سامنے پیش کرتا۔ شیخ مجھے مبارک باد دیتے اور میری تقریروں کو پسند کرتے، پھر دوسرا سبق دیتے۔ اس طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ یہاں تک کہ شیخ نے مجھے رخصت کی اجازت دی۔“

اکبر بادشاہ کے نام نہاد مذہب ”دین الہی“ اور اس کے سوات اور بونیر پر حملے کے

### ظالم بادشاہ علامت عذاب ہے

بارے میں پیر بابا کا محاکمہ ہے کہ ”لوگ اکبر بادشاہ کے قہر و غضب میں اس لئے گرفتار ہوئے کہ حدیث میں رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ جس ملک میں گمراہیاں عام ہوتی ہیں اس ملک کو اللہ تعالیٰ ظالم بادشاہ کے عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔“

تذکرہ سلطان الاولیاء میں پیر بابا سید علی ترمذی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خلوت پسند تھے اور گوشہ نشینی کو پسند

### خلوت نشینی

کرتے تھے۔ نیز کم گوئی کے عادی تھے

اخون درویزہ بابا نے "تذکرۃ الامراء والاشہار" صوفی کے امتحان اور آزمائشیں

میں وضاحت کرتے ہیں کہ مرشدنا حضرت

پیر بابا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ساک اور صوفی کو سلسلہ درویشی میں بہت سی آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

اول یہ کہ صوفی کی شہرت عوام و خواص میں پھیل جاتی ہے، بڑے بڑے سربراہ اور وہ لوگ بھی اُس سے ملاقات کی آرزو کرتے ہیں۔ اگر صوفی اس ظاہری عزت پر خوش ہوا اور شہرت پسند بن کر رہ گیا تو قریب الہی سے محروم رہ گیا۔ اگر شہرت پر خوش نہ ہوا اور لوگوں سے کنارہ کش رہا تو لوگ اُسے مغرور و متکبر سمجھنے لگ گئے۔

دوم۔ صوفی کو چاہیے کہ کشف و کرامات کو اپنا مقصود نہ جانے اور ان کے ظہور پذیر ہونے پر خوش نہ ہو کیونکہ مقصود اصلی تو رضائے الہی کا حصول ہے۔ جو کوئی اللہ کی رضا کے سوا کسی بات کو خاطر میں نہ لائے گا، دین و دنیا میں عزت اور نام پائے گا۔

حضرت پیر بابا مریدانِ طریقت بنانے میں بڑی بیعت طریقت و شریعت

احتیاط سے کام لیتے تھے۔ مگر بیعت اتباع شریعت

تمام لوگوں سے لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ مریدانِ شریعت کہا کرتے تھے۔ ان کے استعداد باطنی کا یہ حال تھا کہ ان کی صحبت میں رہ کر جاہل سے جاہل اور بد عمل لوگ بھی متقی اور پیرنگار بن جایا کرتے تھے۔

اخون درویزہ نے اپنی کتاب "ارشاد الطالبین" میں لکھا فیض کے چشمے

ہے کہ شیخ المشائخ سیادت پناہ سید علی ترمذی علیہ الرحمۃ

چودہ سلسلوں کے خاندانوں کے مجاز اور ماذون تھے۔

اخون درویزہ بابا صوفیاء اور بزرگانِ اہل حق کے سماع اور

سماع و رقص

رقص کے متعلق کمال احتیاط اور حد شریعت کے اندر رہنے کی پابندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے مرشد گرامی سید علی ترمذی قدس سرہ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ ایک دن حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نے بغیر حالتِ وجد گفتگو کے ہاتھ اوپر اٹھایا جس سے دیکھنے والے کی نظر میں وجدانی کیفیت کا اظہار مطلوب تھا۔ اُس سال بخارا کے سارے علاقہ پر طرح طرح کی بیماریاں اور بلائیں نازل ہوئیں جن سے بہت سے لوگ ہلاک ہوئے۔ آخر شہر کے معززین اور عابدین اکٹھے ہو کر شیخ کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ بارگاہِ الہی میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو ان آفتوں سے نجات دے۔ حضرت شیخ نے رات کے وقت چھت پر وضو کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہِ الہی میں عرض کی۔ خدایا مخلوق سے ان بلاؤں کو اٹھالے۔ تو آپ کو ہائف نے آواز دی کہ بلائیں تو آپ کے صحو، بغیر وجد ہاتھ اٹھانے کی سزا میں ملک پر نازل ہوئی ہیں۔ اس پر شیخ نے التجا کی کہ الہی! بدعت تو مجھ سے سرزد ہوئی۔ لوگوں کا کیا گناہ؟ سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے۔ ناگاہ آپ چھت سے اترتے وقت سیڑھی سے گر گئے اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگ عبادت کے لئے آئے اور کہنے لگے ہم تو آپ کو وسیلہ بنا کر دفعِ بلا چاہتے تھے، آپ خود ابتلاء میں آگئے! فرمایا ”گناہ اصل میں میرا ہی تھا لیکن تم پر بھی ابتلاء آگئی۔“ اسی وقت سے شہر بخارا اور نواحی علاقوں سے امراض اور آفات کا خاتمہ ہو گیا۔

رازداری | اخون صاحب کا کہنا ہے ایک دن میں حضرت مخدومی سید علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے ساتھ ایک بیابان میں سفر کر رہا تھا۔ جب تصوف کے بعض دقیق نکات کا ذکر آیا تو حضرت نے اپنا منہ میرے کان سے لگا کر نہایت رازدارانہ طریق پر وہ نکتہ مجھے سمجھایا حالانکہ ہم دونوں کے علاوہ اُس ویرانے میں کوئی نہ تھا۔ لیکن چونکہ سابقہ بزرگانِ دین نے اس سلسلے میں رازداری سے کام لینے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ اسلئے حضرت پر بابائے اُس پر عمل کیا۔

شرطِ اول | حضرت پر بابا کہتے ہیں: مبتدی کے لئے اول زمینہ کردار و گفتارِ مسطویٰ پر مکمل کاربند ہونا ہے کہ اس سے سر جو تجاوز بھی جائز نہیں۔

انخون درويزه گئے مہا ہے کہ دشمنوں حقیقی  
مرید کی باطنی استعداد سے بخوبی باخبر ہوتے

## استعدادِ باطنی

ہیں، وہ مرید کی باطنی استعداد کے مطابق ہی اس کو اوراد و نوافل کی تلقین  
اس شخص کے حسبِ حال کرتے ہیں تاکہ وہ کسی زعمِ باطل یا شیطانی وسوسے میں گرفتار  
نہ ہو جائے۔

حضرت پیر باباؒ کی عادت تھی کہ مرید بناتے وقت  
حد سے زیادہ احتیاط برتتے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ

## خدائی امانت

، خدائی امانت ہے اور امانت اسی کو سپرد کرنی چاہیے جو اس کا اہل ہو۔

انخون درويزه نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ  
ملا عباسی ایک غریب الدیار شخص کو لے کر مخدوم

## طالبانِ حق پر خصوصی شفقت

الانام سید علی ترمذی رپیر باباؒ کے پاس آئے اور پتہ زور سفارش کی کہ یہ شخص رموز  
طریقیت پانے کا مستحق ہے اور جگہ جگہ اس کی تلاش میں پھیر رہا ہے۔ اس شخص نے  
تباہی کہ وہ ہرات کا رہنے والا ہے اور تلاشِ مرشد میں سرگردان ہے مگر بہت سے  
نامور علماء و مشائخ سے ملنے کے باوجود اب تک گوہر مقصود حاصل نہیں ہوا، اس  
نے کہا کہ وہ خراسان، شمالی ہند، کشمیر اور لداخ کی خاک چھان چکے ہے، اب سرزمین  
یوسف زئی میں وارد ہوا ہے۔ چشمِ عنایت کا طالب ہے۔ حضرت نے اسے اپنے ہاں  
بٹھرایا اور اس پر توجہ دی۔ بالآخر وہ شخص علومِ ظاہری و باطنی میں اوجِ کمال تک پہنچ گیا  
جب وہ تمام مراحل طے کر چکا تو اسے اجازت دی کہ وطن واپس جائے اور لوگوں کو  
فیض یاب کرے۔ انخون صاحب کا کہنا ہے کہ ہم نے حضرت طالبِ صادق کے ساتھ  
حد سے زیادہ شفقت فرمایا کرتے تھے۔ اور اسے مقاماتِ عالی تک پہنچانے کی  
ہر ممکن سعی کیا کرتے تھے۔

## اصلاح عقائد

اخوند درویش کے مطابق حضرت پیر باباؒ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں میں سارے فتنہ و

فساد بے علم "پیروں" اور نام نہاد علماء و سوار کا پیدا کیا ہوا ہے۔ حضرت جہاں بھی جاتے وہاں کے علماء کے عقائد کی جانچ پڑتال کرتے۔ ہر عالم سے علیحدگی میں ملتے۔ اس کی اصلاح کی کوشش کرتے اور اگر پھر بھی وہ غلط شریعت و روش پر قائم رہتا تو لوگوں کو اس کے فساد سے آگاہ کرتے اور اعلانیہ اس کی مخالفت کرتے۔

## اسلامی حکومت کی ضرورت

حضرت پیر باباؒ نے جو دور پایا، وہ دین سے بے نیازی کا دور تھا۔ مغلوں کی حکومت کو مسلمانوں کی

حکومت تو کہا جاسکتا ہے لیکن اسلامی حکومت ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ اکبر کے عہد حکومت میں آزاد خیالی اور افساد کا زیادہ دورہ تھا، بالخصوص حسری علاقوں میں کوئی اسلامی حکومت نہ تھی۔ پیر باباؒ کہا کرتے تھے کہ توضیح اور اشاعت اسلام علماء کا کام ہے لیکن تقویت و اجراء شریعت اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ اخوند درویش کہتے ہیں تاہم سرزمین یوسف زئی میں حضرت پیر باباؒ کا وجود بہت غنیمت تھا۔ وہ نہ ہوتے تو نہ جانے یہاں کے لوگ دین سے کتنے بے بہرہ رہ جاتے۔

## دوستی یا دشمنی کا معیار

اگرچہ بانیہ انصاری کے عقائد و نظریات کی پیر بابا

کہا کرتے تھے "اے لوگو! میرا اس کے ساتھ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ اگر یہ اپنے عقائد کو درست سمجھتا ہے تو میں اسے کہتا ہوں، میرے سامنے آئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو ولایت عطا کی ہو تو ایسے موقع پر وہ کرامت دکھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں اس کے عقائد کی تردید میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ دعا کروں گا۔ وہ بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اگر اس کے ہاتھ کھٹ کر زمین پر گر پڑیں تو قزوہ اپنے عقائد باطلہ سے توبہ کر لے اگر ایسا نہ ہو اور میری دعا نامقبول ہوتی تو میں اپنے آپ کو شرمسار سمجھوں گا"

— اگر بائزید کو اپنی کرامت نمائی پر یقین ہو تو آئے اور یہ بات آزما کر دیکھ لے۔  
مجھے تو اس سے کرامت کے اظہار کی کوئی توقع نہیں، صرف وہ میرے وار کا دفاع کرکھائے۔  
— اگر وہ یہاں سے ہاتھ سلامت لے گیا تو تمام قبائل اسے ہادی اور صادق سمجھیں ورنہ جان  
لسن کہ وہ جھوٹا اور فتنہ پرداز ہے۔ پیر بابا کے واضح چیلنج کے باوجود بائزید انصاری  
کو ان کے سامنے آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

مرشد کی تعظیم و اطاعت | جب شیخ سالار رومی علیہ الرحمۃ نے پیر بابا

سید علی ترمذیؒ کو اپنا ماذون اور خلیفہ مجاز قرار دیا تو پیر باباؒ اس ذمہ داری کے  
بوجھ سے بہت خائف تھے وہ دربار شیخ سالار رومی کے پاس یہ درخواست لے کر  
گئے کہ اپنی ماذونیت کی پابندی سے آزاد کیا جائے۔ اس پر سالار رومی علیہ الرحمۃ نے  
فرمایا۔ "اے سید علی اساتذہ اور شاخ کرام کے (شرعی) امر کی اطاعت مرید کے فرائض  
میں داخل ہے۔" گویا مرید اور شاخ کرام کا فائدہ اسی میں ہے کہ شیخ اور استاد کی بتائی ہوئی  
راہ پر چلے۔

"تذکرہ سلطان الاولیاء میں ہے کہ فقیر اسے کہتے ہیں

فقیری کے درجے |

جو اپنے ظاہر اور باطن کو آراستہ کرے، ظاہر کو  
ظاہری اعمال نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے اور باطن کو خلوص اور ایمان سے۔  
فقیر کو ان امور کا خیال رکھنا چاہیے (۱) توبہ (۲) شکر (۳) رضا (۴) صبر (۵)  
زہد (۶) تواضع (۷)، تقویٰ (۸) توکل — جو شخص ان اوصاف کو حاصل کرے وہ  
فقیر ہے۔ علم، تقویٰ اور سلوک میں ان اوصاف کو مقامات کہتے ہیں۔ درویشی کا  
اصل مقصود حق تعالیٰ کو راضی کرنا ہے۔

علماء حقانی اور اولیاء اللہ کی مجالس میں بیٹھنا اٹھنا

رابطہ شیخ |

اس لئے فائدہ رساں ہے کہ اس طرح ان کی صحبت



کے انوار حاصل ہوتے ہیں۔ فن تصوف و سلوک میں رابطہ شیخ ضروری ہے یعنی یا تو خود حاضری دے یا خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھے۔

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ پر کسی حلقوں کی جانب سے الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مغل بادشاہوں

## بادشاہوں سے کنارہ کشی

کے حامی تھے اور ان کی خوشنودی کے لئے کام کرتے تھے لیکن حضرت پیر باباؒ ابدار ہی سے درباری زندگی اور امیروں اور بادشاہوں کی صحبت اور دنیا داری سے کنارہ کش رہے نہ تو زندگی بھر شہنشاہ ہمایوں سے ملاقات کی نہ کسی اور صاحب تخت و تاج سے۔ ان کی ساری زندگی فقر و فاقہ اور درویشی میں گزری۔ کسی سے ان کا اختلاف تھا تو وہ بھی اللہ کے لئے اور دوستی بھتی تو بھی اللہ ہی کے لئے۔

## مجاہدانہ کارنامے

حضرت سید علی غواص المعروف پیر بابا ترمذی علیہ الرحمۃ کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی شرف یہ عطا کیا یہ خانوادہ کسی دور میں بھی عظمت سے محروم نہیں رہا۔ ہر دور میں آج تک اس لڑی میں ایسی نامور ہستیاں موجود رہیں جو یا تو اپنے زہد و تقویٰ کی بدولت قابل تعظیم تھیں/ تھیں یا اپنے کمال علم و فضل کی وجہ سے عوام میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں اور یا دنیوی وجاہت کے اعتبار سے انہیں معاشرے میں نمایاں مقام حاصل تھا..... نہ صرف مسلمان عوام سادات بونیر اور کونٹر کو سرا انھوں پر بٹھاتے رہے بلکہ والیان ریاست یہاں تک کہ بادشاہان کابل اپنی بیٹیاں اس گھرانے میں بیاہنے کو اپنے لئے باعثِ یمن و سعادت تصور کرتے رہے۔ اسی نامور گھرانے کے سید اکبر شاہ اور سید عبدالجبار شاہ سوات کے بادشاہ رہے۔ سید محمود شاہ کونٹر پر فرمان روائی کرتے رہے۔ سید جلال و سید شاہ مرتضیٰ کچھلی و ہزارہ کے نائج قرار پائے۔ فخر مشرق سید جمال الدین انغالی تین چار بادشاہوں کے دور میں انغالیان میں منصب وزارت پر فائز رہے۔ اسی طرح سادات ترمذی سے سنیکٹروں دوسرے افراد دین اور دنیا دونوں کی سعادتوں سے بہرہ ور رہے اور معاشرے میں بڑا نام پایا۔

اصل میں اللہ تعالیٰ جب کسی علاقے کو اپنی رحمت سے نوازا نا چاہتا ہے تو وہاں اپنا کوئی برگزیدہ بندہ لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے اس نیک بندے کی بدولت لوگ رُوبہ اصلاح ہوتے ہیں اور معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے اہل قرار

پاتے ہیں..... وہ کیا مبارک ساعت ہوگی جب سلطان الاولیاء سالار عظام اللہ رومی علیہ الرحمۃ نے اپنے نور بصیرت کی بنیاد پر سید علی غواص ترمذی پر پیر بابا کو ہدایت کی تھی کہ وہ کوہستانی علاقہ میں قیام کر کے یوسف زئی اور دوسرے نواحی لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کریں... کون نہیں جانتا کہ پیر بابا کی آمد سے پہلے یہ علاقے کتنی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے، کفر اور شرک کے اندھیاروں نے انہیں کس بُری طرح سے گھیر رکھا تھا..... خانہ جنگیاں اور خون خرابے کتنے انسانوں کا خون پی چکے تھے اور انڈاس، ناداری اور ذلت نے یہاں کس طرح ڈیرے ڈال رکھے تھے..... پھر کوہستان سوات اور بونیر کے کفار کی گمراہی کا تو پوچھنا ہی کیا؟..... نہ ان کے کوئی مقررہ قاعدے قانون تھے..... نہ وہ کسی خاص مذہبی عقیدے کے پیروکار تھے..... وہ اسی طرح زندگی بسر کر رہے تھے جیسے پتھر کے زمانے کا ابتدائی وحشی انسان..... یہ لوگ گانے بجانے اور شراب نوشی کے رسیا تھے..... اپنی ہی بہن بیٹیوں سے شادی کرنا اس لئے اچھن سمجھتے تھے کہ اس طرح ران کے نزدیک منسل خالص رہتی ہے..... ان لوگوں کی زندگی حیوانوں کی تھی..... البتہ شکل و صورت میں گورے چٹے ہوتے تھے اس لئے بعض لوگ انہیں قدیم بت پرست یونانیوں کی نسل سے قرار دیتے تھے بلکہ بقول سید عبدالعبار شاہ ایک بار برطانوی وزیر اعظم گلڈسٹون نے پارلیمنٹ میں اس قدیم یونانی قبیلے کو اپنا ہم قوم جان کر اس کے تحفظ اور سرپرستی کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا.

حضرت پیر بابا نے نہ صرف خود ساری زندگی ان وحشی لوگوں کی اصلاح میں گزار دی اور اسلام کا پیغام رحمت ان تک پہنچایا بلکہ ان کے خلفاء اور اولاد نے بھی ان کی وفات کے بعد اس سلسلہ جہاد و تبلیغ کو سرگرمی سے جاری رکھا..... اس سلسلے میں اخون درویش بابا، اخون پنجو بابا، خون سالاک، دیوانہ بابا وغیرہ کے علاوہ خود پیر بابا کے صاحبزادے سید مصطفیٰ اور پوتوں سید عبدالوہاب، سید قاسم اور سید حسن کی مساعی جمیلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں.

کوہستانی کفار کے خلاف اس جہاد کے مرکزی قائد تو حضرت پیر بابا کے پوتے سید عبدالوہاب

تھے۔ راجن کا قیام بونیر کے مرکزی مقام تختہ بند میں تھا تاہم لشکر اسلام کا سالار ہونے کا شرف  
 اخون سالاک کے حصے میں آیا۔ اس جہاد سے قبل اخون درویزہ بابا تو وفات پا چکے تھے۔ البتہ  
 ان کے ایک صاحبزائے شریک جہاد تھے جو داد شجاعت دیتے ہوئے ایک کافر سردار بنرد کے  
 ہاتھوں شہید ہوئے اور کاجو ضلع سوات میں ان کی تدفین عمل میں آئی..... وہ شہید بابا  
 کے نام سے موسوم ہوئے اور آج بھی ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔

جہاد کا یہ سلسلہ کوہستان ڈوما سے شروع ہوا جو اس زمانہ میں چغرزئی، بسی خیل اور  
 نصرت خیل کا مسکن تھا۔ یہ علاقہ کوہ سیاہ کے بالمقابل دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع  
 ہے۔ سارا علاقہ پہاڑوں کی نکیلی چوٹیوں سے آٹا پڑا ہے اور بہت ہی دشوار گزار ہے یہی وجہ  
 ہے کہ اس کی تسخیر کے لئے مجاہدین اسلام کو ٹبری دشوار یوں کا سامنا ہوا..... یوسف زئی  
 اور منڈانڑ قبائل نے اس جہاد میں دل کھول کر حصہ لیا۔ ہر مسلمان قبیلے کا لشکر اپنے اپنے سردار  
 کی کمان میں اس جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہا خصوصاً خد خیل کے مجاگو خان نے اپنی بہادری  
 کا سکہ دشمنوں سے منوایا..... کفار کا لشکر اپنے سردار حاکم ڈوما کی کمان میں تھا۔ وہ ڈوما کے  
 قلعے میں مقیم تھے جو پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ جب گھمان کارن  
 پڑا اور فریقین میں دست بدست لڑائی کی نوبت آئی تو عیسیٰ زئی کے قبیلہ حسن زئی کی شاخ  
 کوٹوالی کے ایک جانباز کے تیر سے حاکم ڈوما ہلاک ہو گیا۔ اپنے راجہ کے مرتے ہی کفار نے  
 حوصلہ ہار دیا اور مسلمان لشکر پر کوہستان میں فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ بہت سا مال غنیمت  
 اور قیدی مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگے۔ قیدیوں میں راجہ ڈوما کی حسین و جمیل رانی بھی تھی جسے  
 اخون سالاک نے باگو خان کے حوالے کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ پنجتار، چلم، پجز کی اور ڈھیری  
 کے موجودہ خواتین اسی رانی کے لطن سے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی تشکیل و جیہہ اور بہادر ہیں۔  
 اخون سالاک نے کافی عرصہ تک کوہستان علاقے میں قیام کیا۔ ان کی تبلیغ کی بدلت  
 ہزاروں لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ بعد میں انہوں نے اپنے

دائرہ کار کو کاغان، آگرور، گلگت، چترال، مستونج اور کالا ش تک وسیع کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ ان اہل اللہ کی کوششوں سے وہاں کے لوگوں کی اکثریت مسلمان ہو گئی بلکہ ان کے دلوں میں اسلام سے اتنی محبت پیدا ہو گئی کہ آج سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی یہ لوگ اسلامی تعلیمات کے گردیدہ اور شیدائی ہیں اور کوئی چیز انہیں صراطِ مستقیم سے ہٹا نہیں سکی۔

**سوات** | اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت پیر بابا پہلے پہل سوات اور یونیر کے علاقوں میں آئے تو حالت یہ تھی کہ اکثر لوگ وحشی اور اُجڑے تھے

ان کا کام لے دیکے راہزنی اور ڈاکہ زنی تھی، شراب ان کی گھٹی میں پٹری ہوتی تھی، جبکہ جبکہ شراب کشید کرنے کی بھٹیاں ان حضرات نے اپنی آنکھوں دیکھیں، یہاں کے لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ دوسرے کا جانی دشمن تھا، پہاڑی ندی نالوں کی وجہ سے علاقہ مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر جگہ کی زبان دوسری جگہ سے جدا تھی... ایسے لوگوں تک اللہ اور اس کے رسول کا پیغام پہنچانا جان جو کھوں کا کام تھا، تاہم پیر بابا کے ارادت مندوں کی کوششوں سے... اسلامی تعلیمات کی روشنی ہر قریہ اور ہر بستی تک پہنچی اور لوگ جاہل حق پر اس نچنگی سے گامزن ہوئے کہ آج... وہاں شراب نوشی، سود خوری اور بدکاری کا نام و نشان تک نہیں، لوگوں کی اکثریت نماز، روزہ کی پابند ہے، عہد کی پابندی اور مہمان نوازی میں کوئی ان کا ثانی نہیں، اسلامی غیرت ان میں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے، وہ غریب ہیں لیکن انتہائی خوددار اور غیور و جسور۔

سوات میں کفار کے خلاف جہاد کے قائد سید قاسم بن سید مصطفیٰ بن سید علی ترمذی رپیر بابا تھے جبکہ سالار لشکر ہونے کی سعادت اخون عبدالرحیم فرزند اخون درویزہ کو حاصل تھی جہاد کا یہ سلسلہ بالائی سوات کے گاؤں برانیاں سے شروع ہوا... غازیان اسلام برابر آگے بڑھتے رہے انہوں نے دریائے سوات کے منبع تک کا وسیع و عریض علاقہ کلام، گارائے اور پنجکوڑہ زیر نگین کر لیا، شدید مقابلوں کے بعد کفار تمکست سے ہم کنار ہوئے انہی معرکوں

میں اخون عبدالرحیم داد شجاعت دیتے ہوئے ایک کوہستانی کافر بھیزو کے ہاتھوں شہید ہوئے۔  
 جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وہ دریائے سوات کے مغربی کنارے پر کاجونا می گاؤں میں مدفون ہیں  
 جب سید قاسم علیہ الرحمۃ کا مزار بالائی سوات کے مقام پیرکلی میں ہے۔ . . . . اللہ نے ان  
 کی اولاد کو اتنی برکت دی کہ وہ اب تک بالائی سوات کے علاقوں میں آباد ہیں اور کئی گاؤں ان  
 کی ملکیت ہیں اس طرح دین اسلام کے فروغ و استحکام کے لئے جو کارنامہ پیر بابا کی اولاد اور  
 ان کے ارادت مندوں نے انجام دیا، وہ سلطان محمود غزنوی کے علاوہ آج تک کسی مسلمان  
 بادشاہ سے بھی بن نہ آیا۔

## چترال

ان دو بہتات کے علاوہ کفار کے خلاف جہاد کی تیسری مہم سید عبدالوہاب  
 کے فرزند سید جمال الدین اول المعروف سید جمال ہنسے وادی کوئٹہ  
 کے مقامات پشت اور سلام پور کے قریبی کوہستانی علاقہ میں عمل میں آئی۔ . . . . اس جگہ  
 چترال کی سرحد کے ساتھ کفار قدیم کی کثیر تعداد آباد تھی۔ . . . . غازیان اسلام کی ہر ممکنہ  
 کوشش کے باوجود یہ سارے کافر قبائل زیر نہ ہو سکے۔ اور کیلاش رکا فرستان، میں حالیہ دور  
 تک ان کی کافی تعداد موجود رہی۔ ان کافروں کے دو بڑے گروہ ہیں، سیاہ کافر اور لال کافر  
 ان کی تھوڑی سی تعداد اب بھی وہاں آباد ہے اور عجیب و غریب عقائد کی حامل ہے۔ جیسا کہ بتایا  
 جا چکا ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد یہ کافر اہل یورپ کے لئے بڑی دلچسپی کا موضوع بن گئے۔  
 فرنگی کی دلی خواہش تھی کہ کفار کے قدیم کلچر کو بحال رکھا جائے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ  
 میں وزیر اعظم گلڈسٹون نے ان سے ولی بہر دی اور ہم آہنگی کا اظہار بھی کیا۔ گلڈسٹون کا  
 اعلان سنتے ہی افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمن سمجھ گئے کہ اہل کیلاش سے بہر دی کی  
 آڑ میں انگریز ان علاقوں پر قبضہ جانے کی نکر میں ہے۔ اس لئے شدید برف باری کے باوجود  
 انہوں نے ایک فوجی مہم ان علاقوں کو بھیج کر لال کافروں کو مشرف بہ اسلام کر لیا اور اس علاقے  
 پر تسلط پا کر اس کا نام ”کافرستان“ سے ”نورستان“ بدل دیا۔

حضرت پیر بابا اوزان کے خلفاء کی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ سرزمین یوسف زکی کے لوگوں میں جہاد کا جذبہ آج تک مزاح زن رہا۔ سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والوں میں بھی ان علاقوں کے لوگ پیش پیش رہے۔ پیر سبک میں ۱۸۲۷ء میں ہمارا جہدِ نجیت سنگھ کے فولادی لشکر سے ٹکر لینے والے بھی یہی مجاہد تھے اور ۱۸۶۳ء میں امبیلہ کے مقام پر پوسے ہندوستان کی فزنگی فوجوں کے دانت نکھٹے کرنے والے بھی یہی مردان تیغ آزماتھے۔۔۔۔۔ یہ فخر بھی سوات، بونیر اور کوہستانی علاقوں کو حاصل ہوا کہ آج تک اس مٹی پر کسی غیر مسلم کو قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اپنی خود نوشت میں سید عبدالجبار شاہ کا کہنا ہے کہ حضرت پیر بابا کی آمد سے قبل خود پختون قبائل بھی ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوتے تھے۔۔۔۔۔ ہر طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلے کو اس کے ملک سے نکال کر اس پر خود قابض ہو جایا کرتا تھا۔ مثلاً خلیل پھند نے دوسرے غور پاخلیل قبائل کو نکال کر پشاور کے نواحی زرخیز علاقوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ اسی طرح دلازاک کو بھی اپنے پہلے مسکن سے بھگا دیا گیا تھا تاہم پیر بابا، اخون درویزہ اور دوسرے اہل اللہ کی تربیت سے متاثر ہو کر پختون قبائل باہمی خانہ جنگیوں سے باز آ گئے اور اس کے بعد کسی ایک قبیلہ نے دوسرے پر ہاتھ اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔

اسی طرح ان صوفیائے کرام کی تعلیمات کے نتیجے میں سرحدی علاقوں میں علماء اور صوفیاء کی بڑی قدر افزائی ہوئی۔ لوگوں نے اپنی زمینیں تبرکاً اور تیناً سادات کرام، اخون خیل اور کانخیل حضرات کو بے دیں، ہردینی اور دنیوی معاملے میں ان حضرات کی راتے کو صائب سمجھ کر فوقیت دی جانے لگی۔ لوگ علماء کی ہدایات پر چلنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے قریباً ہر معرکے میں مجاہدین کی قیادت انہی علماء اور صلحاء کے ہاتھ میں رہی۔۔۔۔۔ یہی حضرات لوگوں کے باہمی تنازعات ختم کراتے۔۔۔۔۔ دو قبیلوں میں کوئی تنازعہ اٹھ بکھڑا ہوتا تو غیر جانبدار





تھا۔ ترکوں کے عہد میں یہ میدان ہزارہ قاروق اس وسیع ولایت پکھلی کا ایک حصہ تھا۔ جو کشمیر  
راولپنڈی آنک اور گلگت کے تمام درمیانی علاقوں پر مشتمل تھی؛

پکھلی پر حضرت بابا کے خاندان کی حکومت کیسے قائم ہوئی؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سید  
عبدالجبار شاہ کا کہنا ہے کہ

”حضرت سید قاسم نبیرہ حضرت سید علی خواص ترمذی رپر بابا کا ایک فرزند سید جلال  
چھوٹی عمر میں طلب علم کی خاطر اپنے وطن سے پکھلی پہنچا جو شمالی ہزارہ میں ایک زرخیز خطہ تھا اور  
جہاں قدیم ترکوں کی ایک وسیع و عریض سلطنت عہد قدیم سے تھی۔ یہ لوگ اغلباً تیمور کے ہمراہ آئے  
تھے تاہم اس علاقے میں ہندوں کے جواریں رہتے رہتے ان میں ہندوانہ رسمیں گھر کر چکی تھیں ان  
دنوں اس ریاست کا فرمان روا سلطان محمود نامی ایک ترک تھا۔۔۔۔۔۔ چونکہ اس کے دارالحکومت  
میں بہت سے علماء اور اہل کمال موجود تھے اس لئے دور دور سے لوگ ان سے فیض پانے پکھلی آیا کرتے  
تھے، سید جلال بھی اسی سلسلے میں یہاں ولہد ہوئے۔۔۔۔۔۔ وہ نہایت شکیں اور و صیہہ تھے۔ چہرے  
بشرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی عظیم خاندان کے چشمہ چراغ ہیں۔ تاہم ان دنوں چونکہ طابع  
کو استادوں کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ اپنے کپڑے خود دھونے ہوتے تھے اور مسافرانہ زندگی گزارنی  
پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اپنا حسب نسب کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ سید جلال نے بھی یہ نہ بتایا کہ وہ کس  
نامور خاندان کے فرد ہیں۔ اتفاقاً راجہ سلطان محمود نے انہیں دیکھا تو بڑا متاثر ہوا۔۔۔۔۔۔ اس  
کے کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ وہ سید قاسم کے فرزند ہیں جو ان دنوں سائے علاقہ یوسف زئی  
اور افغانستان کے روحانی اور دنیوی پیشوا تھے اور جن کی کوششوں سے سائے علاقے میں اسلام کی  
روشنی پھیلی تھی۔۔۔۔۔۔ اس پر سلطان محمود نے سید جلال کو دربار میں بلایا۔ بڑی عزت  
و تکریم کی اور کچھ عرصہ بعد اپنی بیٹی سے جو نہایت ہی عقلمند اور بہ صفت موصوف خاتون تھی ان  
کی شادی کر دی۔۔۔۔۔۔ ساتھ ہی بھوگڑ منگ کا علاقہ انہیں جاگیر کے طور سے دیا جہاں وہ امن

د چین سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس پر ترک درباریوں اور سلطان محمود کے رشتہ داروں نے سید جلال کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور طرح طرح کی سازشیں کھڑی کر دیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ سلطان محمود سید جلال کے قتل کے ذریعے ہو گیا۔ اس نے خفیہ طور پر اپنے سپاہیوں کا ایک جتھہ بھیجا کہ وہ چپکے سے سید جلال کا کام تمام کر دیں۔ سید جلال ان سازشوں سے بے خبر تھے۔ اتفاق سے وہ راجہ سلطان محمود سے ملنے کے ارادے سے کھلی آرہے تھے کہ راتے میں ڈگ کے مقام پر یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل ڈاڈر سینی ٹوریم قائم کیا ہے، ان کا آسنا سامنا راجہ کے مسلح سپاہیوں سے ہو گیا۔ انہیں دیکھتے ہی راجہ کے سپاہیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ شدید زخمی ہوئے تاہم گھوڑا اٹھاتے ہوئے واپس اپنے گھر بھوگٹر منگ پہنچ گئے۔۔۔۔۔ ان کی بیوی معاملے کو میاں پگئی تاہم اس نے انتہائی رازداری سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنے قلعے کے ایک کمرے میں لٹا دیا۔ مرہم پٹی کی اور تیمارداری میں لگ گئی۔ صحت یاب ہونے پر سید جلال نے علاقہ سوات دہلی سے ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا اور پگئی پر حملہ کر دیا۔ اس موقع پر راجہ سلطان محمود شہنشاہ ہند سے ملاقات کی خاطر دہلی گیا تھا اس لئے سید جلال کو کسی خاص فراحت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ آسانی سے سائے علاقہ پر قابض ہو گیا۔

”تاریخ ہزارہ“ مؤلفہ کیپٹن دیس میں اس واقع کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

پیر بابا (سید علی غواص ترمذی) کی چوتھی پشت سے سید جلال بابا ملک بونیر سے اپنے ساتھی مرادخان رموث اعلیٰ خوانین گڑھی صیب اللہ کشمیر کو جلتے ہوئے ریاست کھلی کے صدر مقام گلی باغ میں آکر ٹھہرے، سلطان محمود ترک دراجہ اس ملک کا فرمان روا تھا۔ اس نے انہیں خاندانی معزز سمجھ کر بڑی خاطر مدارات کی۔ کچھ عرصہ بعد سلطان محمود نے اپنی بیٹی سید جلال سے بیاہ دی اور علاقہ بھوگٹر منگ جہنیر میں دے کر انہیں وہاں آباد کر دیا۔۔۔۔۔ اس قرابت داری پر سید جلال کو سلطان محمود کے معاملات میں عمل دخل حاصل ہو گیا۔۔۔۔۔ سید جلال وہاں رہے تو

ان کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ اس پر سلطان محمود انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی فکر میں لگ گیا۔ اس نے اپنے آدمی سید جلال کے قتل کے لئے بھیجے۔ ان لوگوں اور سید جلال میں ڈگ کے مقام پر آمنہ سا منا ہوا۔ سید جلال زخمی تو ہوئے لیکن موت سے بچ گئے۔۔۔۔۔ صحت یاب ہونے پر وہ پونیر اور یوسف زئی کو چلے گئے وہاں سے لشکر حبار جمع کیا اور گلی باغ رکھلی (پہلی) پر حملہ کر دیا۔ سلطان محمود ان دنوں وہی گیا ہوا تھا۔ اس لئے آسانی سے وہ سائے علاقہ پر قابض ہو گئے؛

بنایا جاتا ہے کہ ترکوں نے گلی باغ کے خوبصورت شہر کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ سارا شہر جل کر خاکستر ہو گیا۔ سلطان محمود کے بیٹے اور حرم کی خواتین علاقہ کونش کو چلے گئے اور روپوش ہو گئے۔ اس طرح کچھلی میں ترکوں کا اقتدار ختم ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ ۱۳۷۱ عیسوی میں پیش آیا۔

۱۹۰۲ء میں ترکوں کی خانہ جنگی اور عیاشی کے زمانہ میں سید

## فتح ہزارہ

عبدالوہاب بنیوہ حضرت پیر بابا کے پوتے سید شاہ مرتضیٰ راہن

سید جمال) نے حدودوں کا لشکر لے کر علاقہ گردن سے دریائے سندھ کو عبور کر کے ہزارہ پر حملہ کیا اور ہری پور سے موجودہ ریلوے لائن کے ساتھ علاقہ فتح کرتے ہوئے ترکوں کے صدر مقام دھمڑ پر قبضہ کر لیا اور تمام علاقہ اور شش تا مانگل (حد مقبوضہ صواتیان) پر قبضہ کر لیا (مفصل تذکرہ آگے آئے گا)

## جھوٹے مدعیان کا بطلان

اس شخص کی بد قسمتی کا اندازہ لگائیے جو ایک ایک کوڑی جمع کر کے کچھ پونجی بنائے پھر عمر بھر کی اس کمائی سے خالص سونا خریدنے کی نیت سے بازار جاتے لیکن کوئی عیار اور طرار شخص اس کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر سونے کی بجائے اسے پتیل بھتاوے۔ خالص سونا تو تھیں ہاتھ آتے گا جب یا تو خریدار کو اس کی پرکھ ہو یا اسے کوئی ایسا مخلص بے غرض اور ہمدرد شیر مل جلتے جو کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسا ہی کچھ حال بساطِ طریقت کا بھی ہے۔ انسان پر کوئی بیٹا پڑتی ہے تو اس کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ اسے اس سلسلے میں کسی مردِ راہ دان کی ضرورت ہوتی ہے، خوش بختی شامل ہو اور کوئی اللہ کا بندہ مل جائے تو طے شود منزل صد سالہ بہے گاہے کاسماں دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن کھرے کے ساتھ کھوٹا، اچھے کے ساتھ برا اور اصل کے ساتھ جعل کہاں اور کس جگہ نہیں ہوتا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ ایسے صاحبِ نظر کو بھی تسلیم ہے کہ

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہر دستے نہ باید داد دست

ظاہر ہے کہ مرشد کی ضرورت جتنی اہم اور اس کی تلاش جتنا مشکل مرحلہ ہے،

جسلی اور نام نہاد پیروں اور پیشواؤں سے بچنا اور ان کے دام میں گرفتار نہ ہونا اس سے بھی مشکل تر کام ہے۔ مرید اور طالب کے لئے بھی لازم ہے کہ طلب صادق رکھتا ہو۔ یہ نہیں کہ وہ صرف دنیوی مقاصد کے لئے گنڈے تعویذ لینے کو اپنا مقصود حیات سمجھے بیٹھا ہو۔ جادو اور ٹونے ٹوٹکے حاصل کرنے کا خواہاں ہو۔ یا مرشد کی کرامات اور خوارق عادت کو اس کا محال سمجھا ہو۔ قرآن مجید اس ضمن میں ہمارا حوصلہ بڑھاتا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ ضرور ایسا ہوگا جو دوسروں کی اصلاح اور رہنمائی کرتا رہے گا۔ اور یہ کہ **كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ** کے ارشاد ربانی کی تعمیل میں ایسے سچے اور اچھے لوگوں کی صحبت اور معیت ضرور اختیار کرنی چاہیے۔ ایسے حقیقی نائبان رسول اور مسالحن کے زندہ نمونے ہر دور میں موجود رہتے ہیں، ارکان دین میں عملی رسوخ سنت الہی کے مطابق انہی کی تربیت اور صحبت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بیعت کہتے ہیں۔ جس کی تشریح من تصوف کے ماہر امام

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے رسالہ "القول الجلیل" یوں کرتے ہیں کہ

"بیعت سنت رسول ہے اور بیعت کا اطلاق صرف بیعت خلافت

تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوت میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں۔ مثلاً

بیعت خلافت، بیعت جہاد، بیعت توبہ وغیرہ۔ صوفیہ کی مروجہ

بیعت، بیعت تقویٰ میں داخل ہے۔ خلفائے راشدین کے دور

میں اس بیعت کی علیحدہ ضرورت نہ تھی، اس لئے کہ ان سے جو بیعت

خلافت ہوتی تھی اس میں یہ بیعت بھی داخل و شامل ہوتی تھی۔۔۔۔۔

پھر جب ملوک و سلاطین کا دور دورہ ہوا اور خلافت رسول کی بیعت بند

سی ہو گئی تو صوفیائے کرام نے بیعت تقویٰ کی سنت کو پھر سے زندہ کیا۔

کوئی خضر راہ ہو تو بھٹکنے کا فہرہ یقیناً ختم ہو جاتا ہے، عشق و محبت الہی کے اس  
راستے میں خضر راہ کی ضرورت کو حکیم الامت علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں کہ  
اگر کوئی شعیب آتے میسر شہابی سے کلیمی دو قدم ہے

مرشد حقیقی میں کن صفات کا ہونا ضروری ہے اس سلسلے میں جہاں پیر بابا سید  
علی خواص نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہیں حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا  
بھی کہنا ہے کہ مرشد حقیقی وہ ہے کہ

” اس کو مشائخ کی صحبت رہی ہو اور اس نے ان سے ایک عرصہ دراز  
تک ادب اور قاعدے سیکھے ہوں اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان  
حاصل کیا ہو۔ اور یہ شرط اس لئے ہے کہ عادت الہی یہی ہے کہ کسی کو  
مراد اس وقت تک نہیں ملتی جب تک وہ مراد پانے والے سے صحبت  
اور تربیت نہ رکھتا ہو۔“

گویا اس راہ میں بھی مرد راہ دان کا ہونا لازم ہے، راہبر راستے کے نشیب و فراز  
سے آگاہ ہوتا ہے، ایک دوسرے عالم دین کا کہنا ہے کہ:

” شیخ وہ مصلح ہوتا ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ اپنی ہم نشینی سے دوسروں  
کی فطری صلاحیت کو ابھار سکے۔ پس مرید ہونے یا بیعت میں داخل ہونے  
کے معنی اس سے زائد اور کچھ نہیں کہ جس کے صالح اور صادق ہونے پر  
بھروسہ ہو اور جس کی شان طاعت و تقویٰ سے اپنا ضمیر و وجدان بھی مطمئن ہو۔  
اس کے اتباع کا مقصد و اہتمام کیا جائے اور اطاعت و نیاز مندی کے ساتھ اس  
کی خدمت میں حاضری دی جائے۔“

اخون درویشہ باباؒ بھی اپنے مرشد حضرت پیر باباؒ کی زبان سے مرشد کامل کی صفات  
بیشہم وہی بیان کرتے ہیں جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور پیر بیان کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

طالب تصوّف کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک مرشدِ کامل کی صحبت میں عمر عزیز صرف کرے۔ وہ مرشدِ کامل ہو۔ اداس میں وہ صفات موجود ہوں جو تصوّف کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور وہ شخص خود کسی مرشدِ کامل سے تربیت یافتہ اور ماذون ہو۔ جب تک ایسا نہ ہو، وہ کسی اور کو کیا راستہ بتائے گا۔ (مذکورہ طرز) نسبت کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

”صوفیائے محرام کی نسبت نہایت ہی غنیمت ہے۔ اس کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی شرط ایسی ہے جو ہر مسلمان میں ہونی ضروری ہے۔

۱۔ اول بقدر ضرورت علمِ دین سیکھنا اور خواہ کتابوں سے خواہ عالمانِ دین سے پوچھ پوچھ کر، عربی، فارسی، اردو یا جس زبان میں بھی ہو، ضروری دینی مسئلوں سے آگاہی ضروری ہے

۲۔ جو شرعی مسئلے سیکھے جائیں ان پر نچوٹ اور مسلسل عمل پیرا رہنا۔ نیز نفس کی خواہشوں اور لوگوں کی علامت کی پرواہ نہ کرنا“

پھر جس طرح جسمانی بیماری کی صورت میں انسان بہتر سے بہتر اور ماہر طبیب سے رجوع کرتا ہے اسی طرح روحانی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے بھی ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ مرشدِ کامل کی تلاش پوری تحقیق اور جستجو سے کرے، تذکرہ سلطان الاولیاء میں حضرت پیر بابا سے پیر کامل کی یہ خصوصیات شمار کی گئی ہیں:-

اول۔ علومِ شرعی سے بقدر ضرورت واقف ہوتا کہ فساد عقائد اور اعمال نامشروع سے محفوظ رہے اور مریدوں کو اپنی علمی استعداد اور باطن بصیرت کی بدولت غلط شرعی اعمال سے بچائے رکھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی نہ رکھتا ہو اور شریعتِ محمدیہ پر کار بند نہ ہو۔ وہ دوسروں کی کیا رہبری کرے گا۔ بقول ”ادغوشنِ گمست کرا رہبری کند“

دوم۔ مرشدِ متقی ہو یعنی کبیرہ گناہوں بیکہ صغیرہ گناہوں سے بھی مجتنب ہو۔ ہر ایک کا خیر خواہ ہو۔ خوش خلق اور نرم کلام ہو، سخت دل اور نخیل نہ ہو۔

سوم : تارک الدنیا اور راغب الی اللہ ہو، ظاہری عبادات اور باطنی اطاعات پر مداومت رکھتا ہو۔ مہمان نواز اور مہمان پسند ہو۔

چہارم : مریدوں کے اعمال پر نگران ہو۔ ان کے خلاف شرع اعمال پر سرزنش کرے اور ان کے قول و فعل کا محاسبہ کرتا ہے۔

پنجم : مرشد خود بزرگانِ دین کی صحبت سے مینف یا نڈہ ہوتا کہ مریدوں کے نفوس پر بھی اثر انداز ہو سکے۔

ششم : مرشد کے اخلاق و عقائد، اعمال و افعال اسوۂ حسنہ رسول مقبول کے عین مطابق ہوں اور مرشد خود کامل ہونے کا دعویٰ نہ کرتا ہو۔

ہفتم : اس مرشد کے خلفاء بھی پابند شریعت ہوں۔ اس مرشد کی مجلس میں بیٹھنے والوں کی اکثریت عالم فاضل اور پابند شریعت لوگوں کی ہو۔ اس مرشد کامل کی اصل غرض یہ ہو کہ اس کا ہر مرید شریعت محمدیہ کی پیروی میں سبقت لے جانے والا ہو۔

حضرت پیر بابا کے نزدیک مرشد کی ضرورت اس لئے بھی پیش آتی ہے کہ صرف ظاہری احکام پر بے دلی سے عمل کرنے سے بھی دل کی دستگی نہیں ہوتی، مرشد کامل اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ مرید کے باطن کو متاثر کرے تاکہ مرید تقویٰ، طہارت اور خلوص سے بہرہ ور ہو کر صرف عبادت الہی رہے۔ صورتاً کے نزدیک قلب ہی ہمارے جسم میں مقام الہی ہے قلب منور ہو تو افکار میں انقلاب آجاتا ہے اور افکار بدلیں تو اعمال بھی بدل کر رہ جاتے ہیں۔ بقول کسے

دل کے سنبھالنے سے سنبھلتا ہے آدمی

جس نے اسے سنبھال لیا خود سنبھل گیا

حضرت پیر بابا کی نظر میں مرید کے لئے جہاں بدنی عبادات ضروری ہیں وہیں کثرت ذکر بھی لازم ہے۔ ذکر الہی سے باطن متاثر ہوتا ہے اور انسان کے تمام اعمال رضائے الہی کے تابع ہو جاتے ہیں۔



صریحتاً کرام نے جو طریق فقر اپنایا ہے وہ "الْفَقْرُ فَخْرِي" کے فرمان نبوی کی عین متابعت ہے۔ فقر محمدی کو شریعت اسلامیہ سے علیحدہ نظام قرار دینا غلط ہے۔ عارف کامل شیخ احمد بن ابراہیم الواسطیؒ کا کہنا ہے کہ

”اگر سچی درویشی اور اصلی فقیری کی طلب ہے جس کی جبرط مضبوط اور

جس کی شاہین بلند ہوں تو لازم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فقیری اور درویشی کو اختیار کرو۔ اور انہی کی پیروی کرو کہ صاف اور پاکیزہ پانی وہیں ملتا ہے۔ جہاں سے چشمہ بھوٹتا ہے۔ اور بعد میں آنے والوں کی درویشی اختیار نہ کرو۔ کہ پانی سرچشمہ سے دور جا کر گدلا

ہو جاتا ہے اور اس کا اصل رنگ قائم نہیں رہتا۔“

گویا سرور کائنات، فخر موجودات، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیینؐ کا اسوۂ حسنہ ہی وہ معیار ہے جس پر کسی مؤمن اور اہل حق کے اعمال کو پرکھنا چاہیے۔ مدبصطفیٰ برساں خویش را“ ہی کمال ولایت اور کمال تصوف ہے اور اس اسوۂ مبارکہ کے خلاف جو بھی ہے بے حقیقت ہے کہ

خلاف پیمر کسے اہ گزیدہ کہ ہرگزہ بمنزل خواہد رسید

اس فقر محمدیؐ پر کار بند ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ جسم بھی گناہ سے محفوظ رہے اور دل میں بھی غیر اللہ کا ٹھکانہ نہ ہو۔ اور خدا کی طلب اور اسوۂ حسنہ محمدیؐ پر عمل پیرا ہونے کی تڑپ دل پر اتنی غالب آجاتے کہ باطل خیال اس میں سما ہی نہ سکے۔ گویا دل صرت محبوب حقیقی اور مطلوب اصلی کا مقام بن کر رہ جاتے مقامات فقر کی مزید تشریح حضرت پیر باباؒ کے نزدیک یہ ہے کہ فقیری کا ایک درجہ ولایت عامہ ہے جو ہر متقی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس کا دوسرا درجہ ظاہری عبادات کے علاوہ باطن یعنی قلب کو اللہ کی یاد میں مشغول

رکھتا ہے۔ اس درجہ کو اہل تقویٰ و سلوک نسبت کہتے ہیں۔

جہاں تک پیر بابا سید علی غوامی ترمذی علیہ الرحمۃ کی تعلیمات اہم تک پہنچی ہیں یا جہاں تک ان کے مشہور ماذون اور خلیفہ اخون درویزہ بابا نے ان کی تشریح کی ہے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شریعت کے نقطہ کمال ہی کا نام طریقت ہے۔ جہاں پیر بابا اور ان کے ساتھیوں نے عوام کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ارکان خمسہ پر عمل پیرا ہونے پر زور دیا وہیں انہوں نے اس دور کے صوفیائے خام کے پھیلنے سے ہوتے توہمات اور باطل عقائد کے مٹانے میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ پیر بابا نے اپنی باطنی بصیرت سے یہ بات بجا بن گئے کہ اس دور میں شرک و بدعت کا جو بازار گرم تھا اور مطلب پرست عناصر جس طرح عوام کے مذہبی جذبات سے کھیل رہے تھے اس میں عوام کا زیادہ تصور نہ تھا۔ بلکہ بیسیوں مقامات پر پیر بابا اور اخون درویزہ نے بحیثیت مجموعی پختون قوم کی بنیادی خوبیوں اور جذبہ جہاد کی بڑی تعریف کی ہے۔ البتہ وہ زمانہ ایسا تھا جب ان علاقوں میں دینی تعلیم کے لئے کوئی ادارہ تھا نہ حکومت کی جانب سے فروغ و اشاعت تعلیم کا کوئی اہتمام موجود تھا۔ آمدورفت کی آسانیاں میسر نہیں نہ ریل، رسائل کا انتظام افلاس و نکتہ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان کوستانی علاقوں کے مردان جفاکش کی اکثریت دولت اسلام سے بہرہ ور تو تھی تاہم ابھی ان کے رسم و رواج اور طور طریقوں پر سابقہ مذاہب کی چھاپ ضرور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی لوگ سنا سناسخ، سحر و ساحری، شگون اور بدشگونی وغیرہ کے ہندوانہ اثرات سے پوری طرح پھیپانہ پھڑا کے تھے، اپنی سادگی کی وجہ سے وہ اکثر ولایت و بزرگی کے غلط دعوے کرنے والوں کے جال میں گرفتار تھے۔ فال بینی، ستارہ پرستی اور زانچہ بینی کے مشغلے معاشرے میں گھر کر چکے تھے اور اسی طرح اور کئی معاشرتی خرابیاں بھی ماحول کو بڑی طرح متاثر کر رہی تھیں۔ حضرت پیر بابا اولین ہستی تھے

جنہوں نے اپنے ماحول کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔

اس سلسلے میں پیر بابا (اور بالخصوص ان کے مافون اخون درویزہ بابا) کو سب سے زیادہ بائزید انصاری اور اس کے جانشینوں کا مقابلہ کرنا پڑا (مفصل ذکر علیحدہ باب میں کیا گیا ہے) تاہم بقول اخون درویزہ دوسرے تیس کے قریب چھوٹے مدعیان ولایت و نبوت سے بھی پیر بابا کو واسطہ پڑا۔ حضرت پیر بابا نے علمی دلائل اور باطنی نورانیت کی بدولت ان خود ساختہ پیروں کو لاجواب کر دیا اور انہیں راہ فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی۔ یہ حضرت پیر بابا کی تعلیمات اور مساعیٰ عسینہ ہی کا نتیجہ تھا کہ ہر جگہ ان باطل پرستوں کا طلسم ٹوٹا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قعر گننامی میں جا گرے۔ لوگ ارکان اسلام کے پابند ہوتے گئے اور آج چار ساڑھے چار سو سال گزرنے پر بھی ان لوگوں میں عقائد کی سختی اور دین اسلام سے شیفگی پائی جاتی ہے اور وہ اسلام کی سر بلندی کے لئے اپنی جانوں تک کو قربان کرنے پر تیار ہیں۔

اخون درویزہ بابا بکھتے ہیں کہ حضرت پیر بابا، جس جگہ بھی جاتے لوگوں کے دینی احوال معلوم کرتے وہاں کے علماء اور صوفیاء سے ملاقات کرتے، ان سے خلوت میں مختلف اسلامی مسائل پر بات چیت کرتے۔ اگر انہیں کہیں کوئی خامی اور فرورگذاشت نظر آتی تو اُسے دور کرنے کی سعی فرماتے۔ لوگوں کو شریعت مطہرہ کی برکات سے مطلع کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں وہ تاثیر بخشی تھی کہ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے لوگوں کے دلوں میں اتر جاتے۔ ان کے دلائل میں وہ زور تھا کہ کوئی غلط کار ان کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکتا۔ اگر ان علاقوں میں کوئی پیر فقیر وارد ہوتا تو لوگ اُسے حضرت پیر بابا کے پاس لے آتے، وہ اس کے عقائد کو جانچتے اور اس کے غلط عقیدوں کی اصلاح کرتے۔

اس سلسلے میں حضرت اخون درویزہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک

دفعہ پیر عمر اور پیر سلاک (زیا چالاک) دو بھائی جو خشک قبیلہ سے تھے۔ سرزمین یوسفزئی میں دار و سوتے، لوگ انہیں پیر بابا کے پاس لائے تاہم ان کی آمد سے پہلے ہی پیر بابا نے اپنی بصیرت سے ناڑ لیا کہ ان کا مبلغ علم کیا تھا؟۔ چنانچہ پیر بابا نے کاغذ کا ایک پرزہ مجھے دے کر کہا کہ اسے اپنی پگڑی میں رکھ لو۔ جب وہ دونوں بھائی حضرت پیر بابا کے پاس پہنچے تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ ایک کہتا "سات آسمان میری زد میں ہیں۔" دوسرا کہتا "مجھ پر ابھی ابھی انکشاف ہوا ہے کہ ساتویں آسمان سے ایک بلا یہاں نازل ہونے والی ہے۔" اس پر پیر بابا نے میری پگڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا، آسمان تو بہت دور کی بات ہے۔ تم پہلے یہ تو بتاؤ کہ اس پگڑی میں کیا رکھا ہے؟ وہ کھیا نے ہو کر رہ گئے، تاہم اپنی خفت کو چھپانے کے لئے کہنے لگے۔ اس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ جب مجلس کے سامنے پگڑی کھولی گئی تو کاغذ کا ایک خالی پرزہ نکلا۔ اس پر ان دونوں کو راء فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی بارہا ایسا ہوتا کہ پیر بابا ایسے گراہوں کا مناظرہ اور مجادلہ خون درونہ سے کرا دیتے اور خود ان جھنجھٹوں میں نہ پڑتے۔

**پیر پہلوان** | خون درونہ کا کہنا ہے کہ ایک شخص فراسان سے آکر علیدرہ کے مندان قبیلہ میں مقیم ہو گیا۔ بڑا طرار اور باتونی تھا۔ رافضی عقیدے کا حامل تھا اور اکثر خلفائے ثلاثہ کے خلاف الزام تراشی کرتا رہتا تھا۔ اس نے وہیں شادی کر لی۔ خود تو آزاد منش تھا ہی، لوگوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اس کی برسی صحبت کی بنا پر اکثر فوجوان چرس اور بھنگ کے عادی ہو گئے اور دارٹھیاں منڈانے لگے۔ اس پر سارے علاقہ کے لوگ انہیں "کافر خیل" کہہ کر پکارنے لگے۔ اس شخص کو پیر پہلوان کہا جاتا تھا۔ جب وہ فوت ہوا۔ اور لوگ اس کو قبر میں اتارنے لگے تو دیکھتے ہی دیکھتے قبر اس پر تنگ ہو گئی اور اس کی ٹھیاں چٹخنے لگیں۔ یہ حال دیکھ

مگر دفن کو آنے والے لوگ ہیبت زدہ ہو گئے اور جلدی جلدی اس پر مٹی ڈال کر چلے گئے۔ بہت سے لوگ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔

ایک بد عقیدہ شخص، جو لال شہباز قلندر کے نام سے مشہور ہوا۔ باہر سے آکر موضع لنگر میں سکونت پذیر

## لال شہباز قلندر

ہو گیا تھا۔ وہ ایک بھنگ پیئے والا انسان تھا۔ ظہیر الدین بابر نے بھی توڑک میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے دلازاک قوم میں بہت سے لوگوں کو مرید کر رکھا تھا۔ اس لئے اس کے دماغ میں بادشاہی کا سودا سما گیا تھا چنانچہ اس نے علاقہ ڈہوک پر حملہ کیا جو تنولی لوگوں کی ملک تھا۔ وہ اسی جنگ میں مارا گیا۔ جس جگہ اسے دفن کیا گیا اس کا نام شہباز گڑھ پڑ گیا۔

اس قلندر کے حالات میں اخون درویشہ مزید لکھتے ہیں کہ اس نے اپنے مریدوں کے لئے نماز بھی سعادت کر رکھی تھی۔ ایک ولی اللہ سید محمود علیہ الرحمۃ کی ہڈیاں قبر سے نکلوا کر پھینک دی تھیں اور اس احاطہ کو میاں کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا، اس کے بعض مرید جو کئی تھے۔ وہ اکثر ایک اہلق گھوڑے پر سواری کیا کرتا تھا اور کھتا پھرتا تھا کہ میں عنقریب بادشاہ بنوں گا، اسی زعم میں اس نے تنولیوں کے ملک پر حملہ کیا، جہاں در بند کے پہاڑوں میں ہلاکت کو پہنچا۔

ایک اور مدعی ولایت پیر طیب تھا جو خلی افغانوں کے خاندان کافر تھا۔ یہ شخص عقیدہ تاسخ کا

## پیر طیب

قابل تھا۔ اس کا قیام مندانہ قبیلہ میں تھا۔ اس نے اپنے مریدوں کو ان باتوں میں کھلی چھٹی رکھی تھی جن سے اسلام منع کرتا ہے۔ جب اس نے غوث فرسان سید علی غواص ترمذی دہریا بانی کی آمد کا سنا تو چھٹی لکھ کر انہیں دعوتِ مجاہدہ دی لیکن بعد میں اس کی جڑات نہ ہوتی کہ ان کے سامنے آئے، اخون درویشہ لکھتے ہیں کہ اس کی دعوت اس لئے

مرحب برکت ہوئی کہ پیر بابا نے سرزمین یوسف زئی پہنچ کر لاکھوں انسانوں کو فیض پہنچایا بلکہ میرا چشم دید واقف ہے کہ پیر طیب خود آکر حضرت پیر بابا کے ہاتھ پر تائب ہوا۔ بیعت کی اور توبہ گار ہو کر نیک عملوں میں داخل ہو گیا۔ پیر طیب نے نہ مرت اپنے سابقہ گناہوں کا اعتراف کر کے معافی مانگی بلکہ پیر بابا کی صحبت سے اس کی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب آگیا۔

**پیر ولی بڑیچی** پیر ولی بڑیچی بھی عقیدہ تناسخ کا پرچارک تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک آخرت کی سزا و جزا کا کوئی وجود نہیں ہوتا کیونکہ اس جنم کے بعد روح پھر کسی اور صورت میں رہنا ہوتی ہے۔ چونکہ موجودہ زندگی مرت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اس لئے ان کی نظر میں بعد الموت سزا و جزا کا نظریہ بے معنی ہوتا ہے۔ اس شخص کا قیام بھی قبیلہ منڈانڑ میں تھا۔ تناسخ کا عقیدہ ہندو مت کے عقائد میں سے ہے۔ تناسخیوں کا خیال ہے کہ ارواح و نفوس تمام حیوانات ناطق و مطلق میں مشترک ہیں۔ اس شخص نے اور بھی بہت سی باتیں گھڑ رکھی تھیں جن کی وجہ سے لوگوں کی کثیر تعداد اس کے دام تزدیر میں پھنس چکی تھی۔

**کریم داد** کریم داد نامی افغان غوغشتی بھی ایک ایسا ہی بد عقیدہ شخص تھا، اس کا گزر بسر بھی قبیلہ منڈانڑ میں تھا۔ کریم داد نام کا ایک شخص بایزید انصاری رپیردشن کے اخلاف میں سے بھی تھا لیکن یہ کوئی دوسرا شخص ہوا ہے،

**شیخ الیاس** شیخ الیاس بھی سرزمین یوسف زئی کا ایک خود ساختہ شیخ تھا۔ یہ بظاہر بہت عابد و زاہد انسان تھا، مرتبہ کشف جنات تک پہنچ گیا تھا، تاہم چونکہ بے علم اور جاہل تھا اور کسی مرشدِ کامل اور شیخِ محقق کا دستِ گرفتہ بھی نہ تھا، اس لئے کبھی ایک راستہ پر چل نکلتا تھا کبھی

دوسرے پر بالآخر جبریہ مذہب اختیار کر چکا تھا۔ کچھ عرصہ پیرولی کی صحبت میں رہنے سے اور بھی گمراہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی انکار کرنے لگا۔ کبھی گھٹے میں زقار پہن لیتا، کبھی کوئی اور کھیل کھیلنے لگتا۔ ایک دن ملا علی ملیانی نے اس کو متنبہ کیا کہ خلافِ شرع چکر میں کیوں پھنس گئے ہو؟ جس پر اس نے کہا کہ شریعت کا راستہ بہت کھلا ہے، لوگ خواہ مخواہ تنگ دلی سے کام لیتے اور دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں۔ بہر حال ملا علی کی نصیحت کا اثر ثابت ہوئی۔ وہ گلے گلے اخون درویش بابا کے پاس بیٹھنے اٹھنے لگے۔ توفیق الہی نے اس کا ساتھ دیا اور وہ عقائدِ جبریہ و قدریہ وغیرہ سے تائب ہو گیا۔

ملا میر و کامیدان تک و تاز بھی یوسف زئی کا علاقہ تھا۔ عجیب و غریب  
**ملا میر و** | دعوے کیا کرتا تھا، قطب اور غوث سے کم اپنے آپ کو تصور نہیں

کرتا تھا۔ ویسے وہ زہد و عبادت اور مجاہدوں کا عادی تھا۔ عین ممکن ہے کہ اسی عالم محویت میں غیب کے کچھ نظارے کئے ہوں جن کی تاب نہ لا کر بھٹک گیا ہو۔ وہ دعویٰ کرتا تھا کہ اسے علم غیب میں دسترس ہے۔ اس کے ارادت مندوں میں میاں خان خدر زئی وغیرہ شامل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ رب العزت ایک وسیع مکان میں انسان کی صورت میں متشکل ہو کر تخت پر جلوہ افروز ہے۔ شاید ملا میر و کو اس شکل میں متشکل ہو کر شیطان نے اپنی صورت دکھائی ہو ان مریدوں کا سمجھنا تھا کہ ملا میر و نے براہِ راست دربارِ خداوندی میں حاضر ہو کر اپنی انسانی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے اور بغیر کسی واسطے کے اسے اس کی بارگاہ میں شرفِ باریابی حاصل ہے۔

یہ بھی اسی طرح کا ایک نام نہاد پیر تھا، اس کے مریدوں کی  
**شیخ ابراہیم** | اکثریت مندانہ قبیلے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

**شیخ میراں صواتی** | شیخ میراں صواتی بھی علم غیب کا مدعی تھا اور کہتا

کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) اپنی خدائی کے اختیارات و تصرفات مجھے بتلاتا رہتا ہے۔ ملا میرد کے مریدوں نے اپنے مرشد کی شان میں بہت سے قصیدے اور اشعار لکھ رکھے تھے جن میں کہا جاتا تھا کہ عرش کے اوپر فرشتے اور اس کے اوپر ایک سخت پتھر ہے۔ اس پر تخت رکھا ہوا ہے اور تخت پر خیمہ بنا ہوا ہے جس کے ستر دروازے ہیں۔ اس خیمہ کے اندر خدا تعالیٰ ہے جس کی خبر ان علماء کو بالکل نہیں ہے۔

ایک اور بد عقیدہ شخص اور بے باک شخص خلیل روغانی تھا وہ اسی طرح کے عقائد باطلہ کا حامل تھا۔

## خلیل روغانی

شیخ میاں خان کے بارے میں اخون درویزہ لکھتے ہیں

کہ ایک باریوسف زئی لوگوں نے اہل ہزارہ پر لشکر کشی

## شیخ میاں خان

کی تھی مابین خود بھی اس لشکر کے ہمراہ گیا تھا۔ اچانک سخت بارش اور شمالہ باری

نے آن گھرا، طوفان اتنا شدید تھا کہ ہر شخص کو جان کا خطرہ تھا۔ شیخ میاں خان

بھی لشکر کے ہمراہ تھا، چونکہ میدان لوگ اسے پیر سمجھ کر اس کی قدر و منزلت کرتے

تھے اس لئے وہ فوراً اس کی طرف رجوع ہوئے تو اس نے کہا کہ "اس جنگ میں

تمہارے لشکر یوں کے ہاتھوں کوئی ہنایت بر گزیدہ شخص قتل ہو گیا۔ وہ بہت صالح

انسان تھا اور ذاکر حقانی تھا۔ اس کے قتل پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہو گیا ہے اور

اس قدر غصے میں ہے کہ اس کا تخت ڈولنے لگا ہے۔ اگر میں جلدی پہنچ کر اسے

امداد نہ دیتا تو قریب تھا کہ اللہ تعالیٰ تخت سے گر پڑا ہوتا۔ میں نے اسے قہم

لیا اور شمالہ باری رک گئی۔ یہ الفاظ لکھ کر اخون درویزہ کہتے ہیں کہ یہ تھا

اس عہد کے خود ساختہ پیروں کا حال اور ان کے نادان معتقدوں کی عقل۔

اس قسم کے نام نہاد پیشوا۔ وہ جیسے خود جاہل تھے ان کے ماننے والے بھی ویسے

ہی بے علم اور ان پر ٹھ لوگ تھے۔



## شیخ میرادخیل

بھی ایک ایسا ہی بر خود غلط انسان تھا۔ عجیب و غریب دعوے کیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ

نے میرے بہت سے سابقہ کبیرہ گناہ معاف کر دیئے ہیں اور آئندہ بھی معاف کرنا ہے گا۔ یہ شخص ملا میرو کا استاد تھا۔

جہاں ان دنیا پرست پیروں نے اس قسم کی باتیں پھیلانے کا دھندا اختیار کر رکھا تھا اور وہ شہرت طلبی کے پیش نظر ایک سے ایک نرالے دعوے کرتے تھے وہیں عوام کا مذاق بھی سخت بگڑ چکا تھا۔ وہ پیروں سے اسی طرح کی کرامات کی توقع کرتے تھے۔ جنات کی تسخیر کے دعوے بھی اس دور میں بہت زیادہ تھے۔

پیر بابا علیہ الرحمۃ نے جہاں لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات پر کار بند ہونے کی ہدایت کی وہیں واشگاف الفاظ میں انہیں سمجھایا کہ مرشد کا اصل کام شرعی احکام کی تبلیغ ہے۔ اسلام ایک عملی دین ہے، ایمان میں ہر مسلمان سے سوال ہوگا تو یہی ہوگا کہ اس نے ارکان و احکام اسلام پر کس حد تک عمل کیا۔ اس لئے عوام کا فرض ہے کہ پیروں سے دور از کار باتوں اور کرامات کی توقع نہ رکھیں بلکہ صرف اور صرف اسلامی مسائل سیکھیں جن کی بدولت ان کی دنیا بھی سدھری سکے اور آخرت میں بھی سرفروٹی نصیب ہو۔ اس کے ساتھ ہی پیر بابا مشائخ اور صوفیاد پر بھی زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی کرامات کو حتی الامکان چھپائیں۔ ان کا چرچا نہ کریں تاکہ لوگوں کی توجہ ان کی کرامات پر مرکوز نہ ہو بلکہ مشائخ پابندی شریعت کا عملی نمونہ مریدوں کے سامنے پیش کریں اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح پر زور دیں۔

جہاں تک تسخیر جنات کا ذکر ہے اخون درویزہ کہتے

## ملا عمر شلمانی

ہیں کہ خود میرے مریدوں اور شاگردوں میں سے ملا عمر شلمانی

مرتبہ غیب جن پر پہنچکر اس قدر مغرور اور متکبر ہو گیا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ ہماری

صحبت سے دور بھاگتا تھا۔ اس نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے ٹوپی کے قریب پونڈیاں گاؤں کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اخون درویزہ کو مراتبہ میں اس کے حال کی خبر ہوئی تو اسے اپنے پاس بلالیا اور اس کی اصلاح پر توجہ دی۔

یہ شخص اپنی بد عقیدگی میں اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ بعض مسالما

## ملا رکن الدین

میں اس کا دل کو چھو لیتا تھا۔ ذات باری ثقلیٰ

کے بارے میں اس کے خیالات بڑے گمراہ کن تھے۔ خود بھی اپنے خیالات کا پرچار کرتا

اور اس کے پانچ بیٹے عبداللہ، رحمت اللہ، نعمت اللہ، فیض اللہ اور بایزید بھی پشتو

رسائل اور اشعار کے ذریعے لوگوں میں اپنے عقائد پھیلا کر تے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں

نے ایک رسالہ مخالف طریق مذہب مشائخ متقدمین بھی تصنیف کیا تھا اور اپنی علمیت

کا سکہ منوانے کی کوشش کی تھی۔ اخون درویزہ دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا نعمت اللہ نے

خود میرے اساتذہ میں سے ایک کو جس کا نام لطف اللہ بن امام الدین تھا معرفت باری

کے بلے میں دھوکے میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہر حال یہ عنیت تھا کہ اس لغزش کا علم ہونے پر

ان کے والد امام دین نے انہیں گمراہی سے بچالیا اور وہ پھر صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گئے

یہ شخص ہندوستان سے یہاں وارد ہوا تھا، پیشے کے اعتبار

## ملا عبدالرحمن

سے زرگر تھا۔ تاہم سید کہلاتا تھا۔ وہ انسان کی بعثت ثانی اور

احمال قیامت کا منکر تھا۔ بعض دوسرے عقائد میں بھی وہ پیر تارکیت (بایزید انصاری)

کا ہم خیال تھا۔ بارہا اخون درویزہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ عبدالرحمن کے مناظرے

اور مذاکرے ہوتے اسے ہر بار شرمندگی اور شکست کا سامنا ہوتا تھا۔ خاص طور پر

وہ اپنے عقیدوں سے دست بردار بھی ہو جاتا تھا لیکن پھر اپنی ہی روش پر چل پڑتا

تھا۔ اصل میں اسے حکمران بننے کا جنس تھا، چونکہ زرگر تھا اس لئے اس نے اپنے

نام کا سکہ بھی چلایا تھا جو میاں شاہی کے نام سے مشہور تھا۔ جب وہ بادشاہی

حاصل کرنے میں ناکام رہا تو ہزارہ کے مقام مانکرا کے میں سکونت پذیر ہوا۔ پڑھا لکھا تھا اس لئے اپنے عقائد کی تشہیر کے لئے ایک رسالہ بھی تحریر کیا جس کا نام حُسنیہ تھا۔

تانی مہندزئی کو ایک طویل عرصہ تک ہندو جوگیوں کی صحبت میں رہنے سے ہنسنے کا موقع ملا تھا۔ اس نے جوگیا

## تانی مہندزئی

رموز و اسرار سے کافی آگاہی حاصل کر لی تھی۔ وہ عقیدہ تناسخ کا بھی قائل تھا اور دوسرے بعض ہندو عقائد کی طرف بھی مائل تھا۔ اپنے آپ کو صاحب کمال تصور کرتے ہوئے وہ بھی پیر بن بیٹھا تھا۔ اس کا بیٹا اور جانشین عبید بھی اپنے باپ کے مسک پر کار بند رہا۔ البتہ اس کا پوتا شیخ فرید گاہے گاہے علماء کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا اور اپنے غلط عقیدوں سے دستبردار ہو گیا۔

شیخ یوسف مہندزئی بھی اس دور کے پیران تارک ہیں سے تھا اور بزعم خود پیر اور پیشوا بنا ہوا تھا۔

## شیخ یوسف مہندزئی

ایک ادب پر خود غلط شخص سید احمد بن میرو بن حکو تھا۔ جس کی داستان یوں ہے کہ شیخ حسن نامی ایک شخص

## سید احمد بن میرو

نے اجرو نھیال کی جانب سے خشک تھا، ہندوستان سے ایک غلام حکو نامی فرید تھا شیخ حسن کی حیات تک تو وہ غلامی کرتا رہا لیکن اس کی وفات کے بعد غلام ہونے کی بجائے اصریل ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس حکو کے بیٹے میرو نے پیری مریدی کو آسان کام سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو پیر مشہور کر دیا۔ تیسری نسل میں پہنچ کر وہ اور تیز ہو گئے اور میرو کا بیٹا سید احمد کہلانے لگا۔ ایک بار وہ بھٹے پرانے کپڑے پہن کر اور جیس بیل کر حضرت پیر بابا کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کا نام سنا تھا لیکن دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ تاہم وہ اپنی مومنانہ فراست

کی بنا پر اسے پہچان گئے اور اس سے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ علاتے کے لوگ اس کی بزرگی کو تسلیم کرتے اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اس لئے وہ فتویٰ لینے (پیر باباؒ کی) خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ آیا اس کی پیری جائز ہوگی یا نہ؟ اس پر پیر باباؒ نے فرمایا "یہ کام خود سری اور خود روی کا نہیں، شیخ کامل کی اجازت اور طویل عرصہ تک ریاضت و عبادت کے بغیر پیری کا دعویٰ کرنا موجب ضلالت ہوئے ہے۔" اس نے پوچھا "تو پھر اپنے بلے میں اذن کس سے لوں؟" حضرت پیر باباؒ نے فرمایا "اکناف عالم میں لمبے لمبے سفر کرو۔ اہل اللہ کی تلاش کرو اور جس کسی کو دیکھو کہ ظاہری شریعت کا بھی پابند ہے اور باطنی نور سے بھی معمور ہے اس کی خدمت اختیار کرو۔" یہ سن کر وہ وہاں سے تو چلا گیا لیکن کسی مرشد کی تلاش کی تکلیف گوارا کی اور نہ کسی سے اذن لیا۔ البتہ یونہی مشہور کر دیا کہ "میں حضرت بہاؤ الدین زکریا علیہ السلام کی اولاد کی طرف سے ماذوں اور مجاز ہوں اس نے کسی رسالے بھی تصنیف کئے اور پیر بنا رہا۔ اس کا ایک بیٹا سرمست نامی تھا جو اس کا جانشین قرار پایا۔ وہ ہمیشہ رقص و سرود میں مشغول رہتا تھا اور اس شغل کو جائز اور حلال قرار دیتا تھا۔

اپنی پیران خود ساختہ میں سے ایک فرید بھی تھا جس کا قصہ یوں ہے کہ خواجہ خضر افغانی نے جو قبیلہ نازن سے تھا اپنی ایک کینز ایک حجام سے بیاہ دی تھی جو موضع بجاڑہ میں رہتا تھا۔ فرید اسی کینز کا بیٹا تھا۔ کسی قدر تعلیم یافتہ بھی تھا لیکن شومی قسمت سے ہندو جوگیوں کی ایک جماعت میں شامل ہو گیا اور جہاں گروی اختیار کر لی۔ کافی عرصہ تک ان کے پاس رہنے سے وہ ایک کامل سنیا سی بن گیا۔ جو گیان خیالات سے متاثر ہونے کے علاوہ وہ عقیدہ ناسخ کا بھی قائل تھا۔ آدمی ہوشیار تھا۔ کچھ عرصہ تک بادشاہ شیر شاہ سوری کے فرزند سلیم شاہ کے محافظ دستہ میں بھی رہا۔ جب سلیم شاہ کی حکومت جاتی رہی تو

علاقہ یوسف زئی میں آگیا اور یہاں پہنچتے ہی اپنے آپ کو حاجی محمد کے نام سے موسوم کر کے پری مریدی کا دھندا اختیار کر لیا۔ ساتھ ہی یہ بھی مشہور کیا کہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے ایک شخص میر فیض اللہ ولی کا ما دون اور مجاز ہوں۔ ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا کہ میری عمر تین سو سال ہے اور میں نے سات حج کئے ہیں۔ اخون درویزہ بابا کا کہنا ہے کہ ہم نے یہ دعویٰ سننے تو ایک شخص کو حقیقت حال معلوم کرنے اس کے پاس بھیجا۔ جب اس مرد انا نے اس سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ جھٹلا کر کہنے لگا۔ میں نے مدینہ منورہ بہت ہی چھوٹی عمر میں دیکھا تھا اب پوری طرح یاد نہیں۔ اس پر اس کے سات حجوں کی قلعی کھل گئی۔ جب اس کے سلسلہ طریقت کے بارے میں پرسیش کی گئی تو وہ سرزمین یوسف زئی کو چھوڑ کر غوریا خیل افغانوں کے علاقہ کو کوچ کر گیا۔ اصل میں اس شخص کے بہت سے مرید ہو گئے تھے اس لئے اس کے دماغ میں اپنی بادشاہت قائم کرنے کا خیالی سما یا ہوا تھا۔

حاجی عمر غوریا خیل بھی ایک نام نہاد پیر تھا۔ غلط عقائد اس کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ اخون درویزہ اس کے پاس گئے اور وعظ و نصیحت کی۔ جس پر وہ اپنی خطاؤں کا قائل ہو کر ان کے ہاتھ پر تائب ہو گیا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد پھر چند پرلٹے عقائد اختیار کر لئے۔

افغانوں کا ایک اور پیر خواجہ زری جان تھا، وہ تارک صوم و صلہ اور آزاد منش انسان تھا، دوسروں کو بھی آزاد روی کا سبق دیتا تھا، جبریہ نامیہ کا پابند تھا چونکہ وہ شرعی پابندیوں پر زیادہ زور نہیں دیتا تھا اس لئے اس کے گرد ان پڑھ عوام کی بڑی جمعیت جمع ہو گئی تھی۔

شاہ اسماعیل میر علی۔ ابوبکر اور عمر، یہ چاروں شخص قندھار کے ایک چور

کی اولاد سے تھے جس نے دعویٰ کیا تھا کہ میری اولاد سے اولیاء اللہ پیدا ہوں گے یہ لوگ زہد و عبادت اور عملیات اور مجاہدات کی بدولت جنات کی تسخیر میں بھی کسی حد تک حاصل کر چکے تھے، ان کی محفلوں میں رقص و سرود کا اہتمام ہوتا تھا وہ اپنے اوپر حالت جذب طاری کر لیتے اور غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اغلب خیال ہے کہ ان کے علم موجودہ سمرنیم وغیرہ سے ملتا جلتا تھا۔ نٹک قوم کے افراد ان کے بہت گرویدہ تھے۔

اس شخص نے پشاور میں ایک درخت کے نیچے ڈیرا لگا رکھا تھا۔ قلندرانہ زندگی گزارتا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ

## شیخ قاسم غوری یا خیل

اس کی طرف مائل ہونے لگے تو اس نے کئی بدعتیں اور عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دیں جس پر شادمان خان نے جو میرزا حکیم دفرزند شہنشاہ ہالیوں کی جانب سے علاقے کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس کے قتل کا حکم دیا۔ اس پر یہ شخص راتوں رات بھاگ نکلا اور قندھار پہنچ کر عازمین حج کی ایک جماعت میں شامل ہو گیا۔ جب مکہ مکرمہ سے واپس آیا تو اعلان کر دیا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کی اولاد سے افن واجازت لے کر آیا ہوں۔ حالانکہ اس دعوے میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ یہ بات صرف اس نے اپنی پیری مریدی کی دکان چمکانے کے لئے مشہور کر دی تھی۔

متذکرہ بالا لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے جعلی پیر اس علاقے

میں موجود تھے۔ جن کے زیر اثر مسلمان عوام اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال پر توجہ دینے نہ تھے البتہ ان خود غرضوں کے بتائے ہوئے لستے پر چلنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ حضرت پیر باباؒ اور ان کے ساتھیوں کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ انہوں نے ان سرحدی علاقوں میں دسویں صدی ہجری میں پھیلی ہوئی ان فراہوں کا سدباب کیا، لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات کو صحیح صورت

میں پیش کیا۔ ان حضرات کی کوششوں سے معاشرے سے تاریکیاں ختم ہوئیں اور اسلام کے نور سے چاندِ طرتِ آجالا ہو گیا۔ پیر بابا علیہ الرحمۃ کے مشن کی کامیابی کا ہونڈیہ اس امر سے گنایا جاسکتا ہے کہ آج چار سو سال گزر جانے پر بھی ان علاقوں کے لوگ نماز روزہ اور احکامِ شرعیہ کے پابند اور مسلکِ حنفی کے پیروکار ہیں۔ گویا سرزمینِ یوسفِ زئی میں حضرت پیر باباؒ کی آمد یہاں کے لوگوں کی بڑی خوش قسمتی اور سعادت مندی تھی۔ صدیاں گزر جانے پر بھی ان حضرات کرام کی برکات اسی طرح قائم و دائم ہیں، لوگ ان کا نام احترام سے لیتے ہیں اور ان کی اولاد کی دل و جان سے عزت کرتے ہیں۔ رات دن پیر باباؒ کی آفری آرام گاہ پر زائرین کا ہجوم رہتا ہے، لوگ وہاں جا کر سابقہ گناہوں سے توبہ کرتے اور آئندہ محتاط اور شرعِ محمدی کے عین مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اللہ والوں کی بہار کے تے فراں نہیں اور ان پر ہمیشہ یہ شعر صادر آتا ہے کہ

ہرگز نیرد آنکہ دیش زندہ شد عشق

ثبت است بر مریدۃ عالم دوام ما

# پیر روشن یا پیر تاریک؟

یوں تو حضرت پیر بابا سید علی ترندی، اخون درو نیزہ اور ان کے اردات مندوں کو بہت سے بد عقیدہ مدعیانِ ولایت سے مقابلے اور مناظرے کرنے پڑے تاہم ان کے یادگار معرکے وہ تھے جو بانی زید انصاری اور ان کے ساتھیوں سے ہوئے۔

بانی زید انصاری اس دور کی ایک بڑی پراسرار شخصیت تھا، اپنے مخالفین میں وہ پیر تاریک کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جبکہ اس کے حامی انہیں "پیر روشن" سمجھتے تھے۔ مختلف لوگوں نے اس کا جو محاکمہ کیا وہ بڑا دلچسپ ہے، پیر بابا اور اخون درو نیزہ کے نزدیک بانی زید انصاری ملحدانہ خیالات کا پرچارک تھا۔ لیکن بانی زید کے اردات مند اس کے اشارہ ابرو پر جان تک دینے کو تیار رہتے تھے۔

جہاں تک بانی زید انصاری کے حالات زندگی کا تعلق ہے۔ وہ دزیرستان کے مقام کانی گرم کے اڑمڑ قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد کا نام قاضی عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ تھا۔ قاضی عبداللہ پڑھے لکھے انسان تھے۔ ان کا خاندان گھوڑوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا آنا جانا ہندوستان کے کئی شہروں میں بھی ہوتا تھا۔ بانی زید کے ننھیال کا قیام جالندھر میں تھا۔ وہ وہیں پیدا ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ بانی زید ان دنوں پیدا ہوا جب بابر نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس طرح اس کا سال ولادت ۱۵۲۵ء یا ۱۵۲۶ء بنتا ہے۔ اپنی خاندانی روش کے مطابق بانی زید



نے بھی مردِ جہ و سنی تعلیم حاصل کی۔

کہا جاتا ہے کہ قاضی عبداللہ کا سلوک اپنی بیوی (بائزید کی والدہ) سے اچھا نہ تھا اور بعد میں اغلباً اس نے اُسے طلاق بھی دے دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بائزید اپنی تحریروں میں باپ کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کرتا۔ اسی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باپ اسے مردِ جہ علومِ اسلامی کی تعلیم دلا کر اعلیٰ پایہ کا عالم و قاضی بنانا چاہتا تھا جبکہ بائزید طبعاً مجاہدوں، مراقبوں، گوشہ نشینی اور چلہ کشی کی طرف مائل تھا۔ باپ کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ مردِ جہ سلسلہ ہائے طریقت (تقشندہ) سپہروردیہ، چشتیہ، قادریہ) کے کسی شیخ سے بیعت کرے جبکہ بائزید اپنے ہی خیال کے مطابق کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں سرگردان رہتا تھا۔

”صراط التوحید“ بائزید کی مشہور تصنیف ہے، جس سے اس کے عقائد پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب میں وہ مرشدِ کامل کا متلاشی تو رہتا ہے لیکن آخر تک مطلوبہ مرشدِ کامل کو پا نہیں سکتا۔ بالآخر (بقول اس کے) اُسے خواب میں خواجہ خضر علیہ السلام کا دیدار ہوتا ہے جنکی بدولت وہ روحانی مدارج طے کرتا ہے۔ بائزید انصاری کے نزدیک سلوک کی آٹھ منزلیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، قربت، وصلت، وحدت اور سکونت ہیں۔

اپنی خودنوشت میں بائزید انصاری بتاتا ہے کہ وہ مدتوں پیرِ کامل کی تلاش میں سرگردان رہا یہاں تک کہ اس کا دل دنیا سے بائکل اچاٹ ہو گیا۔ وہ پانچ سال تک گوشہ تنہائی میں مقیم رہا۔ اسی دوران اس نے ”صراط التوحید“ لکھی۔ بعد میں اس کی روحانیت کا شہرہ ہوا تو دورِ نزدیک سے لوگ آکر مرید ہونے لگے۔ پہلے اُس نے کافی گرام (وزیرستان) میں تبلیغ کی پھر ننگرہار اور علاقہ مہند کا دورہ کیا۔ اس سفر کے دوران وہ علاقہ بنگش، علاقہ اورک زئی اور تیراہ بھی گیا اور پشاور اور ہشت نگر کے لوگوں کے سامنے بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ کچھ عرصہ وہ مردان کے نواح میں بھی مقیم رہا۔ رفتہ رفتہ کچھ علماء نے بھی بائزید کی حمایت شروع کر دی جن میں مشہور شاعر ملا ارزانی، ملا عمر، ملا علی محمد مخلص، ملا میرزا، ملا پابندہ، ملا دولت

اکوزئی اور ملّا دولت محمد زئی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ملّا ارزانی تو کچھ دیر بعد اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جبکہ دوسرے لوگ اس کے دامن سے وابستہ رہے۔

بائزید انصاری قبیلہ محمد زئی میں مقیم تھا تو چند سرکردہ خوانین بھی اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ جن میں دو اشخاص بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ایک کا نام پانندہ خان تھا دوسرے کا نام بہار خان، بائزید نے باہمی تعلقات کو مزید مستحکم کرنے کے لئے اپنی بیٹی بی بی کمالہ کا عقد پانندہ خان کے بیٹے علی خان سے کر دیا اور اپنے بیٹے عمر کی شادی بہار خان کی بیٹی سے کر دی۔ اسی طرح اس نے اپنے دوسرے بیٹے جلال الدین (جلالہ) کا نکاح بھی محمد زئی کے ایک سرکردہ خان محمد خان کی بیٹی سے کر دیا اور خود بھی ہشنغر کی ایک خاتون دتھی سے بیاہ رچا لیا۔ بائزید کا ایک اور مقتدر خلیفہ مودودی ریا ادائی تھا جو بلوچستان، سندھ اور قلات تک گیا اور ہر جگہ لوگوں کو اپنا حامی بنانے میں کوشاں رہا۔

اسی طرح بائزید نے اپنے ایک اور خلیفہ ملّا دولت کو اکبر بادشاہ کے ہاں بھی بھیجا۔ اکبر نے بائزید انصاری کے عقائد پر کوئی تنقید یا مخالفت نہ کی بلکہ اسے ایک روحانی رہنما سمجھتے ہوئے اس کا بظاہر احترام کیا۔ تاہم بائزید انصاری اور مغل حکمرانوں کے مابین تعلقات کئی یہ خوشگواہی زیادہ دیر تک قائم رہنے نہ پائی اور حالات نے ایسی کروٹ اختیار کی کہ بائزید کی مذہبی جماعت ایک سیاسی جماعت میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

مغلوں سے بائزید انصاری کی مخالفت اور مناقشت کا آغاز یوں ہوا کہ اس کے کئی مرید بہت متشدد اور انتہا پسند تھے۔ وہ ہر وقت ذکر و فکر میں لگے رہتے اور کسی شخص کی دنیوی وجاہت کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے، یہ مجذوب اور مست ملنگ قسم کے لوگ تھے ایک دفعہ ہندوستان سے سوداگروں کا ایک قافلہ کابل جا رہا تھا۔ کسی بات پر اہل قافلہ کا جھگڑا ان بائزیدی مجذوبوں سے ہو گیا۔ مجذوبوں نے نہ صرف انہیں مارا پٹیا بلکہ ان کا مال و اسباب بھی چھین لیا۔ کابل پہنچنے پر ان سوداگروں نے اس واقعہ کی شکایت والئی کابل حکیم میرزا،

راکبر بادشاہ کے سوتیلے بھائی) سے کی۔ انہوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ بایزید انصاری مغلوں کا جانی دشمن ہے۔ اُس کا سوخ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں بڑھ رہا ہے اور لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ اگر بروقت ان کا مواخذہ نہ کیا گیا تو ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اس پر حکیم میرزا نے پشاور کے قلعہ دار معصوم خان کو ہدایت کی کہ بایزید کو گرفتار کر کے کابل بھیجا جائے۔ اتفاق سے جس وقت میرزا حکیم کا یہ پیغام حاکم پشاور کے پاس پہنچا، بایزید کا مقرب مرید پانڈہ خان ہشتنغری بھی وہیں دربار میں موجود تھا۔ اس نے فوراً بایزید کے پاس آدمی دوڑایا کہ جلدی سے وہاں سے کوچ کر جائے۔ اس پر بایزید اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے کر علاقہ مہمند کو نکل گیا اور پھر خیبر تیراہ، اور علاقہ بنگش میں پہنچ کر اپنے ارادت مندوں کو مغلوں کے خلاف اکساتا رہا۔ رفتہ رفتہ ان علاقوں کے لوگ مغلوں کے خلاف مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ یہ مخالفت اتنی بڑھی کہ ایک بار اکبر کا ایک فوجی افسر میرزا سلیمان درہ خیبر سے گزر رہا تھا کہ آفریدیوں نے حملہ کر کے اسے کا مال و متاع لوٹ لیا۔ یہ خبر پشاور پہنچی تو پشاور کے مغل حاکم نے تیراہ پر ہتھ بول دیا۔ اور کزئی اور تیراہی آفریدیوں نے شاہی لشکر کو بھاری نقصان پہنچایا۔ کافی تعداد میں مغل سپاہی مارے گئے۔ جس پر دہلی دربار کی جانب سے راجہ مان سنگھ کو ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ جب کابل کے مغل صوبہ دار نے بایزید انصاری کے خلاف مہم بھیجی تو خون درویزہ کے حامیوں نے مغلوں کا ساتھ دیا۔ دس سال کے قریب دونوں فریقوں میں مختلف مقامات پر لڑائیاں ہوئیں بالآخر بایزید کو گرفتار کر کے کابل میں قید کر دیا گیا۔ جب کسی نہ کسی طرح وہ کابل کی قید سے چھوٹا تو سیدھا ننگر پار پہنچا۔ اب کے اس نے اپنا مرکز اعلیٰ تیراہ کو بنایا اور مغلوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مغل صوبہ دار محسن خان نے تیراہ پر چڑھائی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس طرح تیراہ کے سائے علاقے پر بایزید انصاری کا مکمل تسلط ہو گیا۔ جہاں مغلوں کو ان معرکوں میں بھاری جانی نقصان برداشت کرنا پڑا وہیں بایزید انصاری

کے تین سو تین سو عقیدتمند بھی لڑائیوں میں کام آئے۔

ان کامیابیوں سے بانیزید انصاری کے حوصلے اتنے بڑھے کہ اس نے بہت سا لشکر جمع کر کے سنگر ہار کے راستے کابل پر تہ لوبل دیا، شنوار یوں کے علاقہ میں توراعہ کے مقام پر دونوں لشکروں میں گھمسان کارن پڑا۔ بالآخر بانیزید کی فوجوں کو سپانی کا سامنا ہوا اور وہ خود بھی مارا گیا۔ اس کی وفات کے بارے میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ بانیزید صوبہ دار محسن خان کے ہاتھوں قتل ہوا اور اُسے ہشتنگر میں دفن کیا گیا اور دوسری یہ کہ توراعہ کی شکست کے بعد وہ گرمی اور پیاس کی شدت سے جان بحق ہوا اور اُسے کلیانی کے قریب دفن کیا گیا لیکن بعد میں ان کے دارت تابوت نکال کر لے گئے اور تبرگ اپنے ساتھ پھرتے رہے۔ بانیزید کی وفات ۹۹۳ ہجری میں واقع ہوئی۔

ڈاکٹر محمد جہانگیر نے "مذکرۃ الانصار" کے حوالے سے لکھا ہے کہ بانیزید انصاری کے پانچ بیٹے تھے۔ شیخ عمر، کمال الدین، شیخ نور الدین، شیخ خیر الدین اور شیخ جلال الدین۔ ان میں سے شیخ عمر باپ کا جانشین قرار پایا۔ شیخ عمر نے اپنی ٹیم کو مزید تیز کیا اور مردان اور شہنغر سے بہت سے لوگوں کو ساتھ ملا لیا۔ دوسری طرف یوسف زئی لوگ اختلاف عقائد کی بنا پر شیخ عمر اور اس کے ساتھیوں کی مخالفت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یوسف زئی اور شیخ عمر کے حامیوں کے مابین کئی معرکے ہوئے۔ پہلا معرکہ سرکانے میں ہوا جس میں شیخ عمر انصاری کا پلہ بھاری رہا۔ یہ لوگ اکوزئی کے بہت سے مولشی بھگالے گئے۔ دوسرا معرکہ مینی میں ہوا۔ اس میں بھی میدان شیخ عمر کے ساتھ رہا۔ جبکہ تیسرا اور آخری فیصلہ کن معرکہ دریائے سندھ کے کنارے ٹوپی کے قریب بارہ قنول کے مقام پر پیش آیا جس میں حمزہ خان اکوزئی ریوسف زئی کو فتح کامل نصیب ہوئی۔ شیخ عمر اور اس کا بھائی خیر الدین لڑائی میں مارے گئے۔ نور الدین محمد زئی کے پاس پناہ کا طالب ہوا لیکن کسی نے موقع پا کر وہیں اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بانیزید کے پیرکار ہر وقت اُس کے تابوت کو ساتھ لئے پھرتے تھے۔ لیکن اس جنگ کے بعد جب انہوں نے اپنے

آپ کو بے یار و مددگار دیکھا تو تابوت توڑ کر اس کی لاش کو دریا سے سندھ کی لہروں کی نذر کر دیا۔

مقامی روایات کے مطابق بایزید انصاری کا بیٹا موضع جھنڈا اور مینٹی کے درمیان مارا گیا تھا۔ اس جگہ کو اب بھی جلالی درہ کہا جاتا ہے۔ یوسف زئی نے فتح کی یادگار کے طور پر اس جگہ ایک جھنڈا گاڑ دیا تھا بعد میں اس مقام پر کچھ مکان بن گئے تو گاؤں کا نام بھی "جھنڈا" پڑ گیا۔ ۱۸۸۷ء تک یہاں صرف چودہ مکان تھے جو پنیے کا پانی چار میل دور سے لایا کرتے تھے۔ بایزید انصاری کے باقی بیٹے تو لڑائیوں میں کام آئے لیکن سب سے چھوٹا بیٹا جلال الدین عرف جلالہ بچ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف زئی سے جنگ کے بعد وہ زخمی ہو کر دریائے سندھ میں کود گیا تھا۔ مشکیزے پر دریا پار کرنے کے بعد قبیلہ امان زئی سے پناہ کا طالب ہوا چونکہ وہ نہایت ہی شکیل دو جہیہ تھا، اس لئے لوگوں نے اسے قتل کرنے سے دریغ کیا البتہ اسے گرفتار کر کے قلعہ آٹک میں شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کر دیا۔ شہنشاہ اکبر بھی اس کی مسحور کن شخصیت سے بڑا متاثر ہوا اور اس سے عزت و احترام سے پیش آیا۔ تاہم موقع ملتے ہی جلال الدین قید سے بھاگ نکلا اور تیراہ پہنچے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تیراہ پہنچتے ہی بہت بڑا لشکر جمع کیا اور غزنی پر حملہ کر دیا۔ غزنی کا مغل حاکم اس اچانک حملے کی تاب نہ لاسکا اور بھاگ نکلا جس پر جلال الدین انصاری کے حکم پر اس کے ساتھیوں نے غزنی کو تاخت و تاراج کیا اور بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انصاری کا لشکر غزنی سے واپس آ رہا تھا کہ ہزارہ قبائل کے جنگ آزمان پر ٹوٹ پڑے۔ جلال الدین لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اس کا سر کابل کے مغل گورنر کو بھیجا گیا جبکہ دھڑ کے دو ٹکڑے کر کے ایک کو شہر کے ایک دروازے پر اور دوسرے کو دوسرے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ واقعہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے کہ ۱۵۸۵ء سے ۱۵۸۷ء تک جلال الدین انصاری آفریدی اور اورکزئی لڑائیوں کی مدد سے علی مسجد حیدر آباد تیراہ کے

مختلف مقامات پر منحل فوجوں کے خلاف داد شجاعت دیتا رہا۔ البتہ تیراہ کی ایک جنگ میں اسے نقصان اٹھانا پڑا اور اس کے بہت سے ساتھی قیدی بنائے گئے تو وہ بھاگ کر کافرستان چلا گیا اور وہاں سے واپسی پر فوت ہو گیا۔

ادھر اکبر بادشاہ کی موت پر جہانگیر نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔ اس نے ۱۶۰۷ء میں کابل جاتے وقت شاہ بیگ کوچی (فاتح تندرہارم) کو "خانِ دوران" کا خطاب دے کر تارکیوں یا روشانیوں سے نپٹنے کا حکم دیا۔ اس وقت جلالہ کی موت کے بعد اس کا بھتیجا عبدالواحد یا اعداد اپنے فرقہ کا سربراہ تھا۔ اس کی شادی جلالہ کی بیٹی بی بی علانی سے ہوئی تھی جو نہ صرف حسن و جمال میں بلکہ فہم و تدبیر اور جرأت و عزمیت میں بھی اپنے دور کی عظیم خاتون تھی۔ شاہ بیگ نے اعداد کے خلاف کئی فوجی مہمیں بھیجیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۶۲۰ء میں ہبابت خان کو پشاور اور کابل کا گورنر بنایا گیا جس نے جنگ کی بجائے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے روشانیہ فرقے کے تمام سرکردہ افراد کے اعزاز میں کوہاٹ میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب یہ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو شاہی لشکر ہی ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں جین چن کر قتل کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مقتولوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی تھی۔ انصاری سربراہ اعداد ان دنوں تیراہ کی دادی مستورہ کے دوسے پر تھا اس لئے قتل ہونے سے بچ گیا۔ ہبابت خان نے اس کی گرفتاری اور سرکوبی کے لئے غیرت خان نامی ایک سردار کی قیادت میں ایک مہم بھیجی لیکن غیرت خان کو اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ تیراہیوں نے سخت مقابلہ کیا جس میں غیرت خان اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔

بہر حال مغلوں نے روشانیوں کے خلاف کوششیں جاری رکھیں۔ چھ برس بعد (۱۶۲۶ء میں) ایک اور منحل لشکر مظفر خان کی قیادت میں ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ اب کے بھی سخت مقابلہ ہوا جس میں اعداد مارا گیا اور اس کی مہر سیاست اور عصا جہانگیر کو اس وقت پیش کیا گیا جب وہ کابل جاتے ہوئے درہ خیبر میں پیراڈ ڈالے ہوئے تھا۔ تاہم

احد اذکی موت پر بھی روشنائیوں کی سرگرمیاں ختم نہ ہوئیں۔ اس کے مرتے ہی بی بی علانی خود میدان میں آگئی اور اس نے اپنے نو عمر بیٹے عبدالقادر کو اپنے فرقے کا سردار بنا دیا۔ شاہ جہان بادشاہ کے دور میں بھی بایزید انصاری کے پیروکاروں نے مغلوں پر عرصہ حیات تنگ کئے رکھا۔ بی بی علانی خود گھوڑے پر سوار ہو کر نکل گئی اور لڑاکوں کی کمان کرتی۔ اس تحریک نے پھر سے کافی طاقت پکڑ لی۔ ایک بار منغل لشکر ایک مہم پر منظر خان کی قیادت میں پشاور سے کابل جا رہا تھا کہ درہ خیبر میں اچانک ہزاروں آفریدی اور ادرکنزی نعرے لگاتے ہوئے چٹانوں کی اوٹ سے نکلے اور مغلوں کو گھیرے میں لے لیا۔ شاہی لشکر کو بڑا نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ خود منظر خان کے حرم کی خواتین بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ صرف اس کی ایک بیوی کو سید خان، حاکم کوہاٹ نے بہت سائز و قد یہ دے کر روشنائیوں سے چھڑایا۔

اس کامیابی سے بایزید انصاری کے خیبری عقیدت مندوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ انہوں نے دریائے باڑہ کے قریب ہلم گودڑ کے مقام پر تمام آفریدی لڑاکوں کو جمع کیا اور پشاور شہر پر حملہ کر دیا۔ منغل حکام نے بمشکل تمام قلعہ بالا حصار میں پناہ لے کر جانیں بچائیں۔ تاہم آفریدیوں نے شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ جب اس حملے کی اطلاع مغلوں کے حاکم کوہاٹ سید خان کو ملی تو وہ فوراً مغلیہ فوج کو کمک پہنچانے کے لئے پشاور کو چل پڑا۔ درہ کوہاٹ میں اس کا سامنا قبائلی لشکر سے ہوا۔ تاہم اس وقت قبائلی لشکر کے سرداروں میں چھوٹ پڑ چکی تھی۔ اس لئے وہ متحد ہو کر نہ لڑ سکے اور مغلوں کو آگے بڑھنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ سید خان نے پشاور پہنچ کر قبائلی لشکر پر کاری ضرب لگائی جس سے ”روشنائیہ“ لشکر تتر بتر ہو کر رہ گیا اور منغل اقتدار کو پھر سے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔

سید خان نہ صرف جنگی امور کا ماہر تھا بلکہ سیاسی داؤ پیچ بھی خوب جانتا تھا۔ اس نے بی بی علانی سے نامہ و پیام جاری رکھا۔ وہ بھی دل میں سمجھ چکی تھی کہ آپس کی ناچاقی کی وجہ سے مغلوں کا مزید مقابلہ کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے اس نے بھی مصلحت اسی

میں سمجھی کہ مغل دربار سے کسی باعزت سمجھوتے کی صورت نکل آئے۔ مذاکرات کے نتیجے میں بی بی علائی اور اس کا بیٹا عبدالقادر ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہو گئے۔ اس صلح کے تھوڑے عرصہ بعد عبدالقادر تو مختصر علالت کے بعد راہی ملک عدم ہوا البتہ بی بی علائی اپنے ایک بھائی رشید خان کے ساتھ دہلی میں مغل شہنشاہ شاہجہان کے حضور پیش کی گئی۔ شاہجہان نے اسے فرخ آباد (لوہ پی) میں بہت بڑی جاگیر عطا کر دی۔ جس پر یہ گھرانہ سکون کی زندگی گزارنے لگا، ۱۶۴۷ء میں رشید خان کے قوت ہونے پر روشنائیہ تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

مغلوں اور بایزید انصاری کی اس کش مکش کے باسے میں لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ کئی تو اسے سیاسی رنگ دیتے ہیں اور بایزید انصاری اور اس کے ساتھیوں کو ایک قومی لیڈر کا درجہ دیتے ہیں جبکہ باقی لوگوں کی نظر میں پیر بابا یا انخون درویزہ، حمزہ خان اکوڑی یا مغلوں کی جانب سے بایزید انصاری یا پیر روشن اور اس کے ہم خیال لوگوں کی مخالفت کی بنیاد محض مذہبی عقائد کا اختلاف تھا۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اختلاف رائے کا ہونا قدرتی امر ہے علماء اور صلحاء کسی مسئلے یا کسی عقیدہ و عمل پر اختلاف محض اجتہادی اختلاف ہوتا ہے ایسے اختلاف میں دنیوی مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں نہ ذاتی عناد۔ ایک ہی مسئلے یا ایک ہی حقیقت کی توجیہات مختلف لوگوں کے ہاں مختلف ہوتی ہیں، بسا اوقات ایسی مخالفت میں شدت بھی آجاتی ہے اور مبالغہ یا انتہا پسندی بھی کارفرما ہوتی ہے۔ اس لئے انخون درویزہ اور پیر بایزید کے معرکوں میں بھی کہیں کہیں گمراہی اور انتہا پسندی ضرور ہوگی۔ قارئین کو اس پر پریشان ہونے یا معترض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

ان اختلافی آراء کا محاکمہ کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ انخون درویزہ یا بایزید انصاری کسی کے نزدیک کتنے ہی قابل احترام کیوں نہ ہو۔ خطا اور غلطی سے مبرا



نہیں ہو سکتے۔ وہ بہر حال انسان ہیں۔ مرکب من الخطا والنسیان ہیں۔ جوش اور جذبہ کس انسان میں نہیں ہوتا اور جذبات میں کبھی کبھی شدت کا اظہار قدرتی بات ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی "القول الجمیل" میں انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں مرشد کو چاہیے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچے، صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے۔ اس سے یہ باور کیا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ سے صغیرہ گناہوں کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ لہذا عوام کے ذہن میں مرشد کے مافوق الفطرت ہستی ہونے کا جو مبالغہ آمیز تخیل قائم ہو گیا ہے۔ اس میں اعتدال پیدا کرنا اور اس کی اصلاح ضروری ہے۔ شیخ اول تو درجہ اول کے ہیں ہی کیا..... اور پھر بالفرض وہ کامل سے کامل ہوں۔ جب بھی بہر حال معصوم نہیں ہو سکتے۔ مرتبہ عصمت و معصومیت صرف انبیائے کرام کے لئے مخصوص ہے۔ شیخ غلطیان بھی کرے گا اور عین ممکن ہے اس سے اجتہادی غلطیاں کثرت سے سرزد ہوں۔ دائرہ طریقت و شریعت کے اندر بھی وہ ہر خطار اور لغزش سے محفوظ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر مُصلح یا شیخ خلاف شرع حرکات کا سختی سے محاسبہ نہ کریں تو آخر خرابیوں اور بد عقیدگیوں کا سدباب کیسے ہو؟

اسی طرح ہر کام میں زمان و مکان کے تقاضے بھی ملحوظ رہنے چاہئیں.... پیر بابا اور بانیزید انصاری کا دور آج کا آزاد خیالی کا دور نہ تھا.... آج گھر گھر میں ٹیلی ویژن سیٹ اور ریڈیو سیٹ موجود ہیں۔ اس لئے انسان چاہے تو بھی گانے بجانے اور موسیقی سے بچ نہیں سکتا۔ لیکن اگر چار سو سال پیشتر کوئی شخص مذہبی پیشوا ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے موسیقی کو جائز قرار دیتا تو دوسروں کا اُس پر معترض ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اسی طرح سولہویں صدی کے دقیانوسی ماحول کے پٹھان معاشرے میں گھوڑے پر سوار ایک جوان اور خوب رو عورت کا لشکر کی کمان سنبھالنا عام مسلمان کو کب گوارا ہو سکتا تھا؟ اس لئے اگر بانیزید انصاری کے خیالات اور طرز عمل پر کسی حلقے سے گرفت ہوئی تو یہ

کوئی نرالی اور انوکھی بات ہرگز نہ تھی۔ جو شخص بھی کسی مسلمہ روایت سے بغاوت کرتا ہے۔ معاشرے کی طرف سے اس پر اعتراضات کا وارد ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

” حالانکہ“ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں پیر بایزید کے مخالفین جو اعتراضات کرتے تھے وہ یہ تھے:

۱۔ بایزید نے علم حاصل نہیں کیا، پیر نہیں رکھتا اور چند کلمے نامشروع کہتا ہے۔  
۲۔ وہ اپنے آپ کو ہادی اور رہنما کہتا ہے۔

۳۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔

۴۔ اس کا کہنا ہے کہ خلق منافق ہے۔

۵۔ وہ اپنے باپ تک کے باسے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔

” حالانکہ“ ہی سے اُن جوابات کا بھی پتہ چلتا ہے جو اُن اعتراضات کے جواب میں بایزید

انصاری نے مولانا ذکر یا کو دیئے۔ اُس نے کہا ”میرے پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مجھے انہی کے طفیل سے معرفتِ ذات اور علم توحید حاصل ہوا۔

الہام کے باسے میں اُس نے کہا کہ ”خدا نے قرآن مجید میں کہیں نہیں کہا کہ فلاں پر

وحی بھیجتا ہوں اور فلاں فلاں پر نہیں۔ بلکہ قرآن مجید میں ہے یَنْزِلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ

مِنْ أَمْرِہِ إِلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا لِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ اس کے باسے میں بایزید نے کہا ”میں مسلمانوں

کو منافق نہیں کہتا اگر وہ قرآن و حدیث پر عمل کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ جوابات مسلمان عوام کی تسلی نہیں کرا سکتے تھے۔ خصوصاً سلسلہ وحی کے

باسے میں اس کا یہ کہنا تو بالکل ہی عام سمجھ سے باہر ہے کہ..... ”مہیں! لوگ میرے متعلق

یہ بات غلط کہتے ہیں، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے الہام سے میرے دل پر کتاب

نازل کی ہے۔ اس کا نام ”خیر البیان“ ہے۔ اس میں چالیس بیان ہیں..... لیکن عوام الناس

وحی اور الہام میں فرق نہیں کر سکتے، اس لئے وحی کہتے ہیں۔“

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے بانی زید ہر اعتراض کا گول

مول جواب دے کر ٹال دیا کرتا تھا۔

بانی زید انصاری کو پیر روشنؒ اس لئے کہا جاتا تھا کہ اپنی کتاب ”صراط التوحید“ میں اس نے لکھا تھا کہ اگر چاہو تو میں بتلا دوں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے لوگ کن کن تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آئیں گے۔ . . . . (۱۴) تاریکی کفر سے ایمان کی روشنی کی طرف (۱۵) شرک و نفاق کی تاریکی سے توحید و خلوص کی روشنی کی طرف (۱۶) بدعت و معصیت کی تاریکی سے سنت و اطاعت کی روشنی (۱۷) باہمی اختلافات کی روشنی سے نکل کر اسلامی وحدت کی روشنی کی طرف (۱۸) اور بد خوئی اور تنگ دلی کی تاریکی سے نکل کر نیک خوئی کی طرف۔ . . . . تاہم اسی صراط التوحید کے مطالعہ سے اس کے دعووں کی قلعی اس طرح کھل جاتی ہے کہ وہ بار بار اپنے باپ تاضی عبد اللہ کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ خضر علیہ السلام سے ملاقات کا دعویٰ ہے۔ جگہ جگہ مرشدِ کامل کی تلاش کا ادعا کرتا ہے لیکن آخر تک مرشدِ کامل سے محروم رہتا ہے اس بات کا مدعی ہے کہ بچپن ہی میں اسمِ الیقین تک اور پھر جوانی میں علمِ الیقین سے عین الیقین تک پہنچ گیا تھا۔ تاہم اس کا یہ دعویٰ صرف الفاظ تک محدود رہتا ہے۔ اصل صورت یہ ہے کہ آخر میں وہ صرف اور صرف دنیوی اور سیاسی کاموں میں بہم تن مصروف ہو گیا اور اسی حال میں دنیا سے چل بسا۔ اس کا کہنا تھا ”میرا خیال ہے کہ جگہ وزارتِ عالمِ خدا تعالیٰ کی ہستی سے جدا شے نہیں۔۔۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ الفاظ عقیدہٴ علول کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں دعویٰ کرتا ہے کہ ادھر وجود کی ہستی کو خدا تعالیٰ کی ہستی کے ساتھ یک وجود کر کے دکھلا رہی تھی۔“

ایک اور جگہ لکھتا ہے ”جمعہ کی رات کو اس جگہ جا کر شہر سے باہر تنہائی میں ”اسمِ اعظم“ کا ورد شروع کیا۔ مگر بعض دستوں نے وہاں سے اٹھ آنے پر مجبور کیا۔ وہ اسمِ اعظم کیا تھا؟ اس کا ذکر بانی زید کی کسی تحریر میں نہیں۔“

اسی طرح بایزید انصاری کا کہنا ہے: ”بعد میں مجھے خواب میں اور بیداری میں کہا گیا کہ جو تجھ سے ناتہ لینے آئے اس کو توحید کی راہ بتلایا کر اور سب کو شرکِ حقیقی سے نکال: ”وہ توحید کیا تھی اور شرکِ حقیقی سے نکلنے کا طریق کار کیا تھا؟ یہ وہ سرلبستہ راز ہے جو بایزید کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

سید عبدالجبار شاہ اپنی خودنوشت میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ شخص (بایزید) عجیب پر اسرار شخص تھا۔ اپنے مریدوں کے حلقہ میں بسا اوقات ”نبی“ ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا کرتا تھا اور کم فایہ اور کم پایہ علماء سے اس چالاک کی سے بحث کرتا تھا کہ وہ اس سے متاثر ہو کر اسلام کے بنیادی عقائد سے بدظن ہو کر اباحی بن جلتے تھے۔۔۔۔۔ وہ اصل میں اپنی نئی شریعت رائج کرنے کے درپے تھا۔ حلولِ خدائی کا قائل تھا اور خود کو اوتار اور نبی بھی کہتا تھا!

جب ایک بار اسے قیدی بنا کر شہر کابل لے جایا گیا تو وہاں اپنے معتقدات باطلہ سے بالکل انکاری ہو گیا۔ قید خانے میں زہد و ریاضت پر بے زور دیا جس کی وجہ سے وہاں کے سرکاری کارندوں کو اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس نے حکومت کے ایک وزیر کو ایک کنیز اور تین سو مشقال سونا دیا۔ جس نے اسے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی۔ جب واپس وطن پہنچا تو پھر اپنے سابقہ باطل عقائد کی تشہیر کرنے لگا۔

بتایا جاتا ہے کہ پیر تارک بایزید انصاری کے پاس جو نہر سیادت تھی، اس کی تحریر یہ تھی:۔۔۔۔۔ ”سبحانک الملک الیاری، جہا کرو عالم نوری از ناری۔۔۔۔۔ بایزید انصاری“ ایک دوسری ایسی ہی مہر پر یہ عبارت نقش تھی:۔۔۔۔۔ ”بایزید مسکین ہادی المصلین“

بایزید نے اپنے ارادت مندوں کو قتل و غارت، لوٹ مار اور بدکاری کی بھی اجازت دے رکھی تھی۔ یہ لوگ بزرگوں اور آئمہ دین کے متعلق بڑی بے باکی اور گستاخی سے باتیں کرتے تھے۔ ان دن درویزہ بابا بتاتے ہیں کہ ”یہ لوگ بعت لہذا موت کے بھی منکر تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس جسم کو جس قدر ناز و نعمت میں رکھو اچھا ہے۔ ان کے خیال میں انسان مرنے کے

بعد دوسری صورت میں جہنم لے لیتا ہے، نہ حساب ہے نہ کتاب، نہ دوزخ نہ جنت، یہی دنیا، دنیا بھی بے اور آخرت بھی..... زندگی کے جتنے مزے لوٹ سکتے ہو لوٹو۔“

اس سلسلے میں اخون صاحب ایک واقع لکھتے ہیں کہ اس پیر بانزید نے ایک عورت کو جس کا نام تاشی تھا، اپنا خلیفہ بنا کر تبلیغ پر مامور کر رکھا تھا۔ اصل میں یہ نوجوانوں اور فاسقوں کو جہاں میں پھنسانے کا ذریعہ تھی۔ ایک دن وہ مجھے راستے میں مل گئی۔ میں نے اس سے سوال کیا: ”اللہ تعالیٰ کو تم لوگ وحدہ لا شریک ملتے ہو یا نہ؟..... انبیاء علیہم السلام کو سچے مانتے ہو یا نہ؟.....؟ قرآن مجید کی صداقت پر یقین رکھتے ہو یا نہ؟ جواب میں اس نے کہا ”ہیں سب کو حق مانتی ہوں.....“ تب میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ، انبیاء علیہم السلام اور قرآن مجید سب کی تعلیم تو یہ ہے کہ تم مرنے سے قیامت کو قبروں سے اٹھیں گے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ يُبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ۔ حساب ہو گا، نیکو کار جنت میں جائیں گے اور بدکار دوزخ میں..... لیکن تمہارا پیر اس امر سے انکاری ہے..... اب بتاؤ تم اللہ تعالیٰ اس

کے بنیوں اور اس کی کتابوں کا کہا مانتی ہو یا اپنے پیر کا؟..... وہ اس گفتگو سے

حیران و ششدر رہ گئی..... میری باتوں کو مانتی تو پیر کی باتوں کا بطلان ہوتا تھا اور

نہ ماننے کا کوئی جواز ہی اس کے پاس نہ تھا۔ اخون در دیزہ کا کہنا ہے کہ بانزید کے اکثر ارادت مندوں

کا حالی یہی تھا۔ لاجواب ہوتے تو حیران کھڑے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ بانزید حدیث بیان کرتا

تو اُسے بھی اپنے ہی معنی پہنچا دیتا..... جو حدیث یا آیت اپنے مسلک کے خلاف پاتا

اُسے ماننے ہی سے انکار کر دیتا..... عامۃ المسلمین چونکہ تاسخ اور آواگون کے حکم

سے ناواقف تھے، اس لئے وہ بانزید کی باتوں کی تہ تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ وہ اپنے ارادت مندوں

کو بتایا کرتا تھا کہ مرنے کے بعد یہ جسم عنصری فنا ہو جائے گا اور ہر عنصر اپنے اپنے موافق عنصر

سے مل جائے گا..... یہ جسم دوبارہ وجود میں نہیں آئے گا۔ لیکن روح جو اس کے

خیال میں جزو خداوندی ہے (دوسری صورت اور جسم میں اسی دنیا میں رہے گی.....)

جسم خواہ حیوان ناطق ہو یا حیوان مطلق مگر حیوان وجود میں داخل ہو کر اس کو زندہ کرتا اور اس میں آباد ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ دوسرے امور میں بھی بائزید انصاری کی پسند اور ناپسند کا معیار عام علماء سے جدا تھا.... ”حائنائے کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ

”پیر بائزید اور اس کے مریدوں نے اس علاقے کی موسیقی کے فروغ میں بھی

بڑا حصہ لیا تھا.... ”حائنائے میں ان دو خزانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو

پیر بائزید کے ذریعے سے افغانی قوم کو ملے:

حائنائے میں ہے کہ

”ایک روز وہ (بائزید) دوستوں سے کہنے لگے کہ دو خزانے حق تعالیٰ نے افغانوں سے پوشیدہ رکھے تھے۔ دو شخصوں کے طفیل وہ دونوں خزانے افغانوں پر ظاہر کئے۔ ان میں سے ایک خزانہ علم توحید ہے جس کو خدا تعالیٰ نے پریشان کے طفیل سے افغانوں پر ظاہر کیا۔ دوسرا خزانہ جو ظاہر کیا گیا ہے وہ خزانہ علم موسیقی کا ہے جو حاجی محمد حلیفہ، میر فضل اللہ دل (مرید پیر روشن) کے طفیل سے افغانوں پر ظاہر ہوا۔ اس لئے کہ پہلے افغان غنچگین (ساز) پر اکتارہ بجاتے تھے اور پانچ تار کے رباب پر یعنی سرمدہ دو تار بجاتے تھے اور اسے دو تار کہتے تھے۔

حاجی محمد کی تعلیم اور طفیل سے کسی تار سازوں میں ڈالے گئے اور نئے نئے نغمے نکالے۔ لیکن وہ اکثر نغمے غیر ملائم بجاتے تھے..... جب یہ سازندے پیر دستگیر (پیر روشن) کی خدمت میں پہنچے تو پیر دستگیر کی صحبت اور برکت اور طفیل سے نغمہ ملائم بجانے لگے اور چھ نغمے ایجاد کئے۔ ایک ناصری دوسرے پنج پردہ، تیسرے چار پردہ، چوتھے تین پردہ، پانچویں پردہ جنگ رجو

جنگ کے وقت بجاتے ہیں) چھٹے مقام شہادت اور اس نغمے میں بہت سے نغمے اور بند گائے جلتے ہیں۔

”حالیات کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی محمد مرید فضل اللہ دہلوی (متوفی ۷۹۲ھ ۱۳۹۳ء) نے رباب میں چند تاروں کا اضافہ کیا اور ان کی اس ایجاد پر افغان موسیقاروں نے چند نئے نغمے اضافہ کئے تھے۔ لیکن موسیقار ان نغموں کو غیر متوازن بجاتے تھے۔ پیر بایزید نے ان نغموں میں اصلاح کی۔ ان کی رہنمائی میں موسیقار اس قابل ہوئے کہ سرود و سلوک اور دوسرے حسب ذیل طریقہ نغمات کا سرود بنا سکیں۔

ناصری (دھنا سری) پنج پردہ، چہار پردہ، سہ پردہ، جنگی آہنگ، مقام شہادت سرود کا ذوق پیر بایزید میں شروع ہی سے تھا۔ جب سرود ہوتا تو وجد میں آجاتے تھے ان کے بیٹے اور پوتے بھی ناہر موسیقار تھے۔

یہ تھے دُخزانے جو پیر بایزید نے عطا کئے توحید اور موسیقی..... ”حالیات“ میں دونوں کو اکٹھا شمار میں لانا بھی حیرت انگیز اس لئے ہے کہ توحید اور موسیقی کا باہمی ربط کیا ہے..... پھر یہ تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ انہوں نے افغانی عوام کو موسیقی کا تحفہ دیا لیکن کیا ان سے پہلے افغان عوام توحید اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور نہ تھے؟..... پھر بایزید کا تحفہ اور خزانہ توحید آخر کون سی خصوصیات لئے ہوا تھا۔

ان دو خزانوں کے علاوہ بایزید نے شعر و شاعر کا تحفہ اور خزانہ بھی قوم کو دیا۔ اس

خزانہ کا ذکر ”حالیات“ میں یوں آیا ہے۔

”اس کے علاوہ اس سے پہلے پشتو شاعری میں شعر دو تین قسم سے زیادہ نہ تھے۔ پیر دستگیر بایزید نے افغانی ریشتم زبانی میں تصدیق، غزلیں، رباعیاں، قطعے اور مثنویاں کہیں اور پیر دستگیر بایزید کے طفیل سے

سے ان کے فرزندوں اور مریدوں نے دیوان کہے:

بازید انصاری کے مذہبی عقائد سے قطع نظر سیاسی اور ادبی میدان میں اس نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ خان روشن خان "یوسف زئی کی سرگزشت" میں لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ بازید نے اس تحریک کے ذریعے پٹھانوں کو اپنے وطن کے تحفظ کے لئے متحد اور متفق کرنے کی سعی کی تھی۔ جس میں اُسے بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔" اسی قسم کے افکار کا اظہار عبدالاکبر خان اکبر نے اپنی تصنیف "روحانیات" و "مغلوتاریکیاں" میں بھی کیا ہے۔ . . . . بازید انصاری کی تصانیف میں "صراط التوحید"، "خیرالبیان"، "نحر الطالبین"، "مقصود المؤمنین" اور "حائمانہ" ہیں۔ . . . . اس حقیقت سے ان کا نہیں کیا جاسکتا کہ بازید ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے۔ . . . "خیرالبیان" بڑی مقبول ہوئی۔ . . . خود خون دروینہ نے انہی کی طرز پر "مخزن اسلام" لکھی جو مسجع اور مقفیٰ نشر کے لئے بڑی مشہور ہے۔ بازید انصاری کے اتباع میں پشتو شعراء کا ایک علیحدہ دبستان نکر وجود میں آیا جس کی کاوشوں سے پشتو شاعری کو چار چاند لگ گئے۔

بازید انصاری کے بارے میں بعد کے دانش ورؤں اور معکروں نے متضاد آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کے حامی انہیں "پیر روشن" مانتے ہیں۔ جبکہ ان کے مخالف انہیں "پیر تاریک" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بنوں کے مشہور دانش ور سرفراز خان "خٹک" عقاب بازید انصاری کے عقائد پر تبصرہ کرتے ہوئے "تاریخ خٹک" میں لکھتے ہیں۔

"پیر روشن (بازید انصاری) اصلاً اسمعیلی (سبعی، باطنی) مذہب کا ماننے والا تھا۔ بنگشوں، آفریدیوں اور طورلوں میں اب جو لوگ اہل تشیع عقائد رکھتے ہیں وہ پہلے پیر روشن کے مرید تھے لیکن بعد میں شیعہ مبلغین کی کوششوں سے اثنار عشری عقائد اختیار کر گئے۔"



عقاب صاحب کے نزدیک ”باطنی عقیدے کا علمبردار ہونے کے علاوہ بائیزید انصاری وحدت الوجود کا بھی قائل تھا۔ بلکہ اس کا نظریہ وحدت الوجود اشتمالیت کی کی حدود کو چھوتا تھا۔ وہ زرازن اور زمین کو بھی کی مشترکہ ملکیت سمجھتا تھا۔ اپنے مریدوں کو اس کا حکم تھا کہ جو تمہیں مالی و زر نہ دے اس سے زبردستی چھین لو۔۔۔۔۔ اس کا کہنا تھا کہ عورتیں پھولوں کی طرح ہیں جنہیں ہر کوئی توڑ کر سُونگھ سکتا ہے۔۔۔۔۔ اس کے مریدوں میں عورتیں بھی شامل تھیں اور بلا روک ٹوک مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اس طرح کی آزادی اور ایسے نظریات کی وجہ سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بخوشی اس گروہ میں شامل ہوتے تھے“

عقاب خشک اس امر پر اظہار اطمینان کرتے ہیں کہ ”خشک کبھی بائیزید انصاری (پیر یوشن یا پیر تارک) کے ارادت مند نہیں رہے۔ البتہ بنگش، آفریدی، اور کزئی، طوری اور چند دوسرے قبیلوں کے لوگوں نے اس کا ساتھ ضرور دیا تھا۔ تھوڑے سے یوسف زئی۔ محمد زئی، خلیل اور مہند بھی اس کے ہم نوا تھے“

اخون درویزہ کے تذکرہ الا برار والاشرار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر روشن کے اکثر مریدوں کو ”کشفِ حقیقی“ حاصل تھا، یعنی وہ جنوں کو مسخر کر کے ان سے غیب کی باتیں معلوم کرتے تھے۔

مفسر قرآن حافظ محمد ادریس (مرحوم صدر شعبہ عربی، پشاور یونیورسٹی) بائیزید انصاری کی کتاب ”صراط توحید“ پر مقدمہ لکھتے ہوئے اس کے عقائد پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

”بائیزید اپنے خیالات کے لحاظ سے بے حد انتہا پسند تھے جن دنوں ریاضت میں منہمک ہوتے بقول حضرت اخون درویزہ راہ چلتے ہوئے اس بات کا خیال رکھتے کہ کوئی چیونٹی

ان کے پاؤں تلے آکر ماری نہ جائے۔ لیکن جب اصلاح دارشاد کی طرف متوجہ ہوتے تو اسی انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے سب لوگوں کو مشرک قرار دیتے اور علماء و مشائخ کے احوال و اعمال پر زبردست تنقید کرتے۔ اسی لئے ان کی مقبولیت دن بدن کم ہوتی گئی۔ بعد میں انہوں نے نامور بزرگ سید علی ترمذی ریسر با باہ کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا تو ان کی قوت و شہرت کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچا۔ بالآخر سیاسی بغاوتوں کے نتیجے میں مغلیہ حکومت کی مادی طاقت اور اخون دروینہ کے علمی استدلال نے ان ربا نیرید انصاری کی مذہبی اور سیاسی دونوں تحریکوں کو کچل کر رکھ دیا۔

سید عبدالجبار شاہ اپنی خودنوشت میں با نیرید انصاری کی اسی انتہا پسندی کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب تیراہ کے قبائل با نیرید کے بھڑکانے پر مغلوں کی فوج اور تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے لگے تو مغل بھی لشکر کشی پر مجبور ہو گئے۔ ان کے کارڈوں نے اہل تیراہ کو سمجھایا کہ وہ مغلوں کو لڑائی پر مجبور نہ کریں ورنہ شاہی فوجیں حملہ کر کے انہیں آزادی سے محروم کر دیں گی۔ اس پر بہت سے تیراہی با نیرید کا ساتھ چھوڑ گئے۔ با نیرید نے جب اپنی بازی ہارتی ہوئی دیکھی تو اس نے تیراہ کے سادہ لوح لوگوں کو پیغام بھیجا کہ

”میں خداوند تعالیٰ سے وعدہ لے چکا ہوں کہ تم پر کوئی بادشاہ یا قبیلہ غالب نہ آسکے گا۔ تم ہمیشہ آزاد رہو گے۔ البتہ تم نے محض بادشاہوں کی رضا جوئی کے لئے پیر سے بے وفائی اور وعدہ خلافی کی تو عذاب الہی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس لئے تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ توبہ کا رعبہ کر اور اپنے ہاتھ باندھ کر میری قدم بوسی کے لئے آؤ اور تجدید توبہ کر دو۔“

اس پیغام سے ڈر کر اہل تیراہ میں سے تین تین شخص ہاتھ باندھ کر توبہ کی نیت سے جب پیر ربا نیرید کے پاس حاضر ہوئے تو پیر نے سب کو گرفتار کر کے ان کے

سر قلم کر دیئے۔ یہی نہیں بلکہ جب ان تین سو بیس آدمیوں کو قتل کرا چکا تو ایک سفید گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے مرید بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان سب نے لاشوں پر یوں گھوڑے دوڑائے کہ مقتولوں کی ہڈیاں تک سرمہ بن گئیں۔۔۔۔۔ یہ تھا انتہا پسندی کا عالم کہ چوٹیوں کے مارنے سے بچنے والا طاقت پا کر ایسی سفاکانہ حرکت پر اتر آیا۔

ان خون درونیزہ لکھتے ہیں کہ اپنے تئیں عقیدہ کی وجہ سے شروع شروع میں بانیرید ساگ تک نہ کھاتا تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں ساگ اور گھاس میں بھی جان نہ ہو۔

مشہور صحافی اللہ بخش یوسفی ۱۹ نومبر ۱۹۶۶ء کے ہفت روزہ "آواز پنجتون" میں اس امر کا اذکار کرتے ہیں کہ بانیرید انصاری کے زیر اثر تمام پنجتون ایک آواز پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ پنجتونوں نے بھیت قوم اتحاد اور اتفاق کر لیا تھا انہوں نے اپنے تمام خاندانی، علاقائی اور نسلی حتیٰ کہ مذہبی عقائد کو بھی ایک طرف رکھتے ہوئے اتحاد کا دامن تھام لیا تھا۔۔۔۔۔ (بقول ان کے) بانیرید نے انہیں یہ سبق دیا تھا کہ پنجتون آزاد ہے اور اسے آزاد رہنا چاہیے۔ وہ کسی بیرونی طاقت کا طوقِ غلامی اپنی گردن میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس طرح یہ تحریک مذہبی اور سیاسی عقائد کا ایک ملغوبہ تھی، منغل حکمرانوں نے اس کے خلاف پہلے تو اتحاد اور نردقہ کے فتوے لگوائے، پھر خانہ جنگی پیدا کر دی۔

جہاں کئی سیاسی حلقے بانیرید کی تعلیمات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اس کی تحریک کو ایک وطنی تحریک ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہیں بہت سے ایسے دانش ور بھی ہیں جن کے نزدیک یہ محض ایک وقتی شورش تھی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، اس ضمن میں مردان کے مشہور عالم دین مولانا بدرار اللہ صاحب روزنامہ "جہاد" مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۶۶ء

میں رقمطراز ہیں کہ

” اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ بائیزید اس کے جانشین پختونوں کی خود مختار حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے مغل ان کے خلاف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بائیزید اور اس کے پیروکار خود یوسف زئی اور دوسرے پختون قبائل سے برسریہ پیکار ہے۔۔۔۔۔ اصلی بات یہ ہے کہ روشنائیوں نے کابل جانے والے ایک تجارتی قافلے کو بوٹ لیا تھا جس سے حکومت وقت اور ان کے درمیان مخالفت چل نکلی اور کابل کے مغل گورنر میرزا حکیم کو حاکم پشاور معصوم خان کو ان کی سرکوبی کے لئے ہدایت دینی ہی پڑی“

رسالہ ”صراط التوحید“ کے دیباچہ میں عبدالشکور صاحب (سابق مہتمم عجا گھر پشاور) نے بائیزید کے بارے میں لکھا ہے۔

دو بیسویں صدی کے اکثر محققین اور روشن خیال مفکرین کا خیال ہے کہ بائیزید انصاری (جو پیر تارک اور پیر روشن کے ناموں سے مشہور ہیں) درحقیقت ایک مبلغ رہنما، سیاست دان اور ادیب تھے۔ حضرت اخون درویزہ بابا نے مذہبی تعصب، ذاتی عناد اور سیاسی اختلافات کی بنا پر انہیں ملحد اور زندیق ٹھہرایا“

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے انسانی محاکموں میں اختلافات کا پایا جانا ایک قدرتی امر ہے۔ ہر واقعہ کی توجیہ کسی طرح ہو سکتی ہے۔ تاہم جہاں تک پیر بابا علیہ الرحمۃ کا تعلق ہے انہوں نے بائیزید سے مناظرے ضرور کئے۔ وہ اس سے منظر باقی اور اجتہادی اختلاف بھی رکھتے تھے تاہم انہوں نے اس سخت گیری اور شدت جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا جو اخون درویزہ یا دوسرے کی طرف سے دیکھنے میں آیا۔۔۔۔۔ آج چار سو برس گزر جانے کے بعد پیر بابا اور اخون درویزہ سے اہل سرحد کی عقیدت کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔ تاہم بائیزید انصاری اور اسکے خلاف کے کوئی ارادت مند کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔

# اخون درويزه

پير بابا عليه الرحمۃ کے بارے میں کوئی تحریر یا خون درويزہ بابا کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی۔ پير بابا کی زندگی میں ان کی وفات کے بعد خون درويزہ نے ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ تصنیف و تالیف کا میدان ہو یا مخالفین سے مناظرے کا اجتماع خون درويزہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ وہ بڑی قد آور اور زوردار شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں ان کے حامی اور ارادت مندان کی انتہائی عزت کرتے اور انہیں اپنے دور کی سب سے بڑی علمی شخصیت مانتے ہیں۔ وہیں ان کے مخالف اور حریف ان پر تنقید کے نشتر چلانے سے ذرا نہیں چوکتے۔۔۔۔۔ وہ دوستوں کے حلقے میں جتنے محترم اور معزز ہیں دشمنوں کے نزدیک اتنے ہی مورد عذاب شاید نہی وجہ تھی کہ ”انسائیکلو پیڈیا آف اسلام“ کے مرتب کرنے والوں نے ان کے بارے میں مشورہ دیا تو یہی دیا۔

”اخون درويزہ“ کے بیانات کو بہت ہی احتیاط سے پڑھنا چاہیے کہ وہ بايزيد کی تعلیمات کا عقیدتاً مخالف ہے۔“

شاید یہ رائے دیتے وقت یہ مقالہ نگار پٹھانوں اور بالخصوص ان کے دینی علماء کی نفسیات کو پیش نظر نہیں رکھ سکا۔ وہ یہ بھول گیا ہے کہ پہاڑوں میں بسنے والے یہ لوگ انتہا پسندانہ مزاج رکھتے ہیں۔ جہاں وہ دوست پر جان تک چھڑکنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

وہیں دشمن اور مخالف کو ہرگز نہ ہرگز نہیں بخشے، پھر یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض لوگ عشق اور جنگ میں ہر حربے کو جاننے سمجھتے ہیں..... اگر خون درویزہ نے بائزید انصاری اور اس کے ہم مشربوں سے سخت گیری برتی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جب دونوں فریق ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئے تو مذہبی طور پر بھی اور سیاسی طرز پر انہوں نے ایک دوسرے کو رک پہنچانے کی کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ دونوں فریقوں کی کشمکش اور آویزش کو اسی پس منظر میں دیکھنا بہتر ہوگا۔ آج کے قاری کو چاہیے کہ ”سخن نہم بننے کی حد تک اتنا کرے اور ”طرفداری“ اور ”جانبداری“ سے پہلو بچائے رکھے۔

ہم یہ بات پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ انبیائے کرام کے علاوہ ہم کسی کو معصوم نہیں مانتے..... ہو سکتا ہے ایک ہی بیان یا ایک ہی تحریر کو پڑھ کر دو شخص اس کے بارے میں مختلف رائے اور محاکمہ قائم کریں۔ انسانوں میں اختلاف رائے کا ہونا قدرتی امر ہے۔ ایک ہی مسئلے کے متعلق مختلف علماء مختلف توجیہات پیش کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ پیر بابا اور بائزید یا ان کے ارادت مندوں کے مابین جنگ کسی دنیوی غرض کے لئے نہیں تھی (اگرچہ بعد میں اختلافات نے کچھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر لیا تھا) محض مذہبی عقائد کا اختلاف تنازعے کی بنیادی وجہ تھا۔ اس لئے ان بزرگوں کی کسی غلطی یا زیادتی کو عام انسانی غلطی کی بجائے ”اجتہاد غلطی“ سمجھنا ہی بہتر ہوگا۔ ان میں سے دونوں حضرات کی کسی تحریر و تقریر کو حرفِ آخر نہیں سمجھا جاسکتا اگر ان کی تحریر قرآن و سنت کے مطابق ہے تو اسے اپنانے میں حرج نہیں اور اگر ان کی کوئی رائے قرآن حکیم اور سنت نبویؐ کی روح کے خلاف ہے تو اس سے چشم پوشی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔

”دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق خون درویزہ ایک آتش بیان خطیب، اثر انگیز مقرر و مؤلف اور نہایت سخت گیر محاسب تھے، پشتو، فارسی اور عربی میں تقریر کرتے تھے شعر کہتے تھے اور حاضرین پر چھا جانے کا وصف رکھتے تھے“

اخون درویزہ کے مخالف بھی یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اکبر اور چہانگیر کے عہد میں مذہبی آزاد خیالی اور ملی نہ نظریات نے عام مسلمانوں کے بنیادی عقائد کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ . . . . . لوگ ارکانِ اسلام پر عمل پیرا ہونے کی بجائے فروعی اختلافات اور موٹو گانوں میں وقت ضائع کر رہے تھے، تاسخ، آداگون، جادو ٹونے وغیرہ کے ہندوانہ نظریات مسلمانوں میں بھی رواج پا رہے تھے۔ . . . . . دینی تعلیم کے مدرسوں کا انتظام تھا نہ تبلیغ اسلام کئی کوئی منظم کوشش، ایسے میں اگر پیر بابا، اخون درویزہ، اخون پنجو اور ان کے دوسرے ہم عصر فریخ و اشاعتِ اسلام کے لئے میدان میں نہ نکلتے تو صورت حال بڑی ناگفتہ بہ ہوتی۔ . . . . . ان حضرات بالخصوص اخون درویزہ کی سرگرمیوں کو بھی اسی سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے، یہ ضرور ہے کہ اخون درویزہ نے اپنے مذہبی مخالفوں کے خلاف قلم اور زبان سے تلوار کا کام لیا لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی مساعیٰ حسنہ سے سرحدی مسلمان پھر سے اسلام کے بنیادی ارکان پر کار بند ہو گئے اور ان باہمی مناظروں اور مجادلوں کی بدولت ان سارے علاقوں میں ایک اسلامی نضات قائم کرنے میں بڑی مدد ملی جس کے دُورس نتائج برآمد ہوئے۔

اخون درویزہ کا شمار پاکستان کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے مغلیہ دورِ حکومت میں اپنے آپ کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف کئے رکھا۔ وہ سید علی خواص پیر بابا علیہ الرحمۃ کے خلیفہ خاص اور دستِ راست تھے۔ . . . . . وہ اصلاً ننگر پار کے رہنے والے تھے، وہ اپنے لقب سے ہی پہچانے جاتے ہیں اور ان کا اصل نام اسی لقب سے دب کر رہ گیا ہے، کئی ذرائع نے ان کا نام عبدالکریم بتایا ہے، لیکن یہ ان کے ایک بیٹے کا بھی نام ہے غالباً عبدالرشید نام تھا، درویزہ گدائی کے بیٹے تھے، ان کا سلسلہ نسب یوں ہے، درویزہ بن گدائی بن سعیدی جیون بن جنتی۔ . . . . . اخون درویزہ کے مطابق جیون بن جنتی کابل کے مشرق میں درہ ہند میں اقامت گزین تھے، وہ اصل میں قندز کے رہنے والے ترک تھے اور بلخ کے

ترک حکمرانوں کے قرابت دار تھے۔ جب مہمندوں سے کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تو بلخ کے حکمرانوں نے ان کی مدد کی اور وہ منگولوں کے سردار قرار پائے۔ بعد کے جھگڑوں میں سعدی ٹائے گئے تو ان کے بیٹے گدائی نے بونیر کے علاقہ اسماعیل خیل میں چغرزئی کے مقام پر سکونت اختیار کر لی۔

گدائی نے پاپین کے شہزادوں کے خاندان کی ایک خاتون قراری بنت ملک ناز و خان سے شادی کی، شہہ صحیری میں اللہ نے اس خاتون کو اخون درویزہ سا بیٹا دیا جس نے آگے چل کر بڑا نام پایا۔ درویزہ بچپن ہی سے زہد و عبادت کی طرف مائل تھے اور عام بچوں کے برعکس کھیل کود اور گھڑبار کے کاموں میں دلچسپی نہ لیتے تھے، ایام جوانی میں انہوں نے ملاسنجر پاپینی ملاصرا احمد ملا زنگی پاپینی اور ملا جمال الدین ہندی سے دینی کتابیں پڑھیں..... بعد میں طریقت کے رموز و اسرار تک پہنچے اور حصول معرفت کی خاطر وہ اپنے اساتذہ ملاسنجر کی ہدایت پر شیخ الاسلام، سید المسلمین غوث خراساں سید علی ترندی المعروف پیر بابا کی خدمت میں حاضر ہوئے..... اخون درویزہ نے اپنے علمی مشاغل، شوق زہد و ریاضت کے ساتھ ساتھ اپنی روحانی بے قراری کا ذکر بھی حضرت پیر بابا سے کیا۔ پیر بابا اپنی باطنی بصیرت کی بدولت فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا:

”شیخ کامل انغان گشتہ“

ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا کہ شیخ کامل کی اجازت کے بغیر زہد و ریاضت کا انجام کبھی کبھی نقصان رساں بھی ہوتا ہے۔ لہذا ابتدائی کوچا پیئے کہ زہد و ریاضت اس طریق پر کرے جو طریقہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، کافی دیر تک نصیحت کرنے کے بعد انہوں نے اخون درویزہ سے تجدید توبہ کرائی اور نماز باجماعت، ایام بیضی کے روزوں اور صلواتِ اوابین اور دوسرے واجبات دسمن پر مستقیم رہنے کی تاکید کی۔

اخون صاحب پانچ سال تک اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر رہے اور ان کی ہدایات پر



عمل کرتے رہے۔ پھر اپنے استاد علامہ مولوی حاجی محمد المشہور زنگی پاپنی کی وساطت سے حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کی خدمت میں درخواست کی "علم ظاہر سے آراستہ ہوں، عبادت پر استقامت حاصل کر چکا ہوں۔ اب ذکر الہی کی تلقین کی جائے۔"

جناب پیر بابا نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے طریقہ عالیہ چشتیہ میں داخل کر کے ذکر الہی کی تلقین کی اور فرمایا "اس وقت کا انتظار کرو۔ جب تمہارا قلب ذکر الہی سے معمور ہو جائے گا اور تم کلی طور پر مطمئن ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔" ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اخون صاحب کو اطمینان کامل نصیب ہوا اور وہ اپنے مرشدِ کامل کی توجہ سے بہت تھوڑے عرصہ میں مقاماتِ جلیلہ اور عظیمہ پہنچ گئے۔

علوم متداولہ کی کتابیں تو اخون درو نیزہ پڑھ ہی چکے تھے۔ اب پیر بابا کی ہدایت پر تصوف کی کسی کتاب میں مثلاً جامِ جہاں نما، المعانی، ہوائج اور دیوان انوار خواجہ قاسم وغیرہ بھی ان سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔۔۔۔۔ اپنے مرشدِ گرامی سے روحانی تربیت مکمل کرنے کے بعد اخون درو نیزہ بابا کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اجازت سے دی گئی۔

اخون درو نیزہ بابا نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ کما حقہ ادا کیا۔ انہوں نے قاشقار، چرال، کشمیر اور دوسرے دور دراز مقامات کے دوسے کئے اور وہاں کے علماء صلحاء اور نقرار سے استفادہ کیا۔ جب واپس اپنے شیخِ گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے چاروں سلسلوں میں انہیں مازون اور معنعن فرمایا۔۔۔۔۔ مازون اور صاحبِ اجازت ہونے کے بعد انہوں نے عامۃ المسلمین کی اصلاح کی کوششیں تیز کر دیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ وہ دورِ دینی اعتبار سے بڑی اتبری کا دور تھا۔۔۔۔۔ جو اٹھتا اپنے بھونڈے عقیدوں کا ڈھنڈورہ پیتا۔۔۔۔۔ اکثر لوگ شرک و بدعت اور غیر اسلامی عقائد اختیار کر چکے تھے۔۔۔۔۔ ہر طرف بے عمل علمائے نام نہاد صوفیاء اور اباحتی پیروں کی بھمار تھی وہ لوگ محض دنیوی فوائد کے لئے لوگوں کو اپنی شعبدہ باز لایں سے گراہ کرنے میں مصروف

تھے۔ ایسے میں حضرت اخون درویزہؒ نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان ملحدوں اور منکران دین کے خلاف آخری دم تک اپنے قلم اور زبان سے جہاد کیا..... بتیس سے زائد گمراہوں کی نام نہاد پیشوائیت کا خاتمہ کیا (تفصیل پہلے آچکی ہے) ان سے مناظرے کر کے انہیں لاجواب کیا اور اس طرح عوام ان کے جال سے آزاد ہو گئے۔

یوں تو ان گمراہوں کے سحرِ باطل کو توڑنے کے لئے پیر باباؒ کو بڑی محنت کرنی پڑی تاہم اس سلسلے میں ان کے سب سے بڑے معرکے بانیہ انصاری کے ساتھ ہوئے۔ بانیہ انصاری کو انہوں نے ”پیر تارکیت“ کا نام دیا اور اس کے پیروکاروں کو ”تاریکی“ کہا جانے لگا۔

۱۔ اخون درویزہ باباؒ کو اعتراض تھا کہ بانیہ انصاری :-

۱۔ کل اشیائے موجودہ کو خدا کہتا تھا اور مخلوقات صوری کو ذاتِ خدا جانتا تھا۔  
۲۔ بعث بعد الموت کا منکر تھا۔

۳۔ نامحرم عورتوں میں بیٹھتا تھا۔ اس کی مجلس میں عورتیں اور مرد اکٹھے شریک ہوتے تھے۔

۴۔ عقیدہٴ تناسخ کا قائل تھا اور کہا کرتا تھا کہ حیوانات کے مرنے کے بعد وجودِ صوری نیست و نابود ہو جائے گا۔ لیکن روحیں دوسرے حیوانوں کی صورت میں آئیں گی۔

اپنی تصنیف ”صراطِ توحید“ میں بانیہ نہ صرف اپنے والد کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا ہے، بلکہ خود کو خالص توحید پرست اور دوسروں کو مشرک بھی قرار دیتا ہے۔ وہ مرشدِ کامل سے ملنے کے لئے بے تابی کا اظہار بہت کرتا ہے۔ لیکن آخر تک مرشدِ کامل کو پانہیں سکتا۔

”تذکرہ علماء و مشائخ سرحد“ کے مطابق اخون درویزہؒ نے تین بار اس شخص سے مناظرہ کیا۔ ہر بار اس نے شکست کھائی۔ آخر چوتھی بار فیصلہ کن مباحثہ کے لئے اُسے بلایا

گیا تو وہ سامنے نہ آیا۔

حضرت اخون درویزہؒ بابل نے فروغ و اشاعت اسلام کی راہ میں صرف قلم اور زبان ہی سے جہاد نہیں کیا بلکہ اپنی جان اور اولاد تک کو داؤ پر لگا دیا۔ انہوں نے کوہستان کے کافروں کو داخل اسلام کرنے کے لئے ہمیں بھیجیں..... اسی طرح کی ایک مہم میں خود اخون درویزہؒ کے صاحبزادے عبدالکریم نے شہادت پائی..... ان کا مزار آج بھی کابچو میں مرصع خاص و عام ہے۔ عبدالکریم صاحب کو لوگ ”شہید بابا“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح اخون درویزہؒ نے سارے علاقہ یوسف زئی کا دورہ کر کے ایک لشکر جرار جمع کیا اور بایزید انصاری اور اس کے ساتھیوں سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ آخری قابل ذکر معرکہ میں بایزید کے پیروکاروں کا کیمپ موضع باجا، مینی اور کوٹہ کے پاس نصب تھا جبکہ اخون درویزہ اور ان کے ارادت مند موضع حنڈا، بوکا اور ڈیلور میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ دونوں فریقوں کے لڑاکوں میں اجمیر نامی پہاڑی پرگھمسان کی جنگ ہوئی۔ یوسف زئی رضاکاروں کی کمان اخون درویزہ کے ہاتھوں میں تھی۔ یوسف زئی کے قبیلہ اکوزئی نے اس موقع پر بڑی شجاعت دکھائی۔ اسی قبیلے کے سردار ملک حمزہ خان کے ہاتھوں بایزید انصاری کے ساتھیوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی..... بایزید کے بیٹے یا تو قتل ہوئے یا فرار ہو گئے اس کے بعد انہیں پھر سے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اور یوں بایزید کی تحریک دم توڑ کر رہ گئی۔

اخون درویزہ اور بایزید انصاری کے مابین ہونے والے معرکوں کے بارے میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اخون درویزہ کی کوششوں کی حمایت کرتے ہیں کہ اس نے بایزید کے پھیلائے ہوئے غلط عقیدوں کے خلاف جہاد کیا اور لوگوں کو پھر سے سیدھے راستے پر گامزن کر دیا۔ جبکہ دوسرا گروہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ مغلوں کے ہمارے پرندہ سہی اختلافات کو ہوا دے کر ان علاقوں کے لوگوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کیا گیا۔ چنانچہ ان

لڑائیوں میں طرفین کے ہزاروں لوگ مارے گئے۔

تصنیفات  
اخون درویزہ کے بابے میں جو رائے بھی ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا  
جاسکتا کہ اس نے پشتو زبان و ادب کے فروغ کے لئے بڑا کام کیا۔

انہوں نے ”مخزن اسلام“ لکھی جس میں پشتون عوام کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ  
کیا گیا ہے۔ ”مخزن“ پشتو نثر کی کتاب ہے جس میں مسیح، متقی عبادت بڑی رنگینی  
اور عمدگی سے پیش کی گئی ہے۔ اس طرز نگارش کو اتنا پسند کیا گیا کہ خود بایزید انصاری  
کے پیروکاروں نے بھی اسی کا تتبع کیا۔ اس سے قبل پشتو کو ادبی زبان نہ سمجھتے ہوتے  
نظر انداز کیا جاتا تھا لیکن اس کے بعد پشتو نثر کی بڑی ترقی ہوئی۔ اخون درویزہ اور  
بایزید کے مذہبی مناظروں کی وجہ سے یہاں پایا جانے والا صدیوں کا سکوت ٹوٹا۔ لوگوں  
میں مذہبی جوش اور جذبہ پیدا ہوا اور وہ اسلامی تعلیمات کی طرف مائل ہوتے گئے۔

اخون درویزہ کی تصنیفات ”مخزن اسلام“ کو بہت شہرت ملی۔ یہ پشتو کی مسیح نثر  
میں لکھی گئی ہے، کہیں کہیں عربی اور فارسی عبارات بھی آگئی ہیں۔ کتاب میں اہل سنت  
والجماعت کی تشریح عمدگی سے کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس میں مسلمانوں کے مذہبی فرقوں  
اور بایزید انصاری کے حالات بھی درج ہیں۔

اخون صاحب کی دوسری تصنیف ”تذکرۃ الابرار والاشرار“ ہے جو فارسی میں  
ہے۔ اس میں جہاں سید علی ترندی (پیر بابا) کے مریدوں اور عقیدت مندوں (ابرار)  
کے احوال درج ہیں وہیں بایزید انصاری (پیر روشن) اور ان کے خاندان اور ساتھیوں  
راشرار) کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ فقہ، تفسیر، عقائد اور تصوف کی  
اہدائی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

”ارشاد الطالبین“ فارسی میں چار ابواب پر مشتمل کتاب ہے جس میں توبہ، ایمان  
نماز، وضو، توبہ، پیر کامل کی تلاش، علم اور ذکر، علامات قیامت وغیرہ پر بحث کی

گنتی ہے۔

”شرح مسیدہ امالی“..... فارسی زبان میں مخطوطہ کی صورت میں ہے اور ابھی ریورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

آخری عمر میں اخون دردیز نے پشاور شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی وفات ۱۲۷۸ھ ہجری میں یہیں ہوئی..... ان کا مزار پشاور سے کوئی میل ڈیڑھ میل دور بنزار خانی روڈ پر واقع ہے، اس وقت تک کسی عورت کو آپ کے مزار کے احاطہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ عورتیں باہر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھتی ہیں۔ پشاور میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی بچہ غبی اور کند ذہن ہو یا جسے قرآن مجید حفظ نہ ہوتا ہو وہ آپ کے مزار پر جا کر تین یا پانچ یا سات جمعرات قرآن خوانی کرے تو اس کی زبان روان ہو جاتی ہے۔

اخوان صاحب کے مرید اور بانیِ انصاری کے خلاف جنگ کرنے والے سردار ملک حمزہ خان اکوزئی کی آخری آرام گاہ بھی اسی احاطے میں ہے۔

اخوان دردیزہ کے صاحبزادے، پوتے اور پڑپوتے بھی اپنے اپنے وقت کے نامور عالم دین ہوئے ہیں۔

پشاور میں سزا سزا کے دارالحدیث (پشاور) اور سزا سزا کے دارالحدیث (پشاور)۔

## خلفاء اور اولاد

حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا کے مریدانِ شریعت کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے جبکہ مریدانِ طریقت اور مازونِ خلفاء کی تعداد بھی اس نسبت سے ہوگی۔ تاہم ان سب کے حالات دستیاب نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے مازونِ خلفاء بیس کے قریب تھے۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

حضرت پیر بابا کے  
خلفائیں یہ سب

ار خلیفہ اعظم اخون درویزہ سنگر ہاری

زیادہ شہرت حضرت اخون درویزہ بابا کے حصے آئی۔ انہوں نے اپنے مرشدِ گرامی کی زندگی میں بھی ۲۹ سال تک شب و روزان کا ساتھ دیا۔ ان کی طرف سے مخالفین اور بد عقیدہ لوگوں سے مناظرے اور مجاہد لے کئے۔ کفار کے خلاف جہاد میں سرگرم حصہ لیا۔ مرشد کے وصال کے بعد جس نے اپنے مرشد کے مشن کو آگے بڑھانے کی سب سے زیادہ کوشش کی وہ بھی اخون درویزہ ہی تھے۔ یہ خدمت بھی اخون درویزہ ہی نے انجام دی کہ اپنے مرشدِ گرامی کے حالات قلمبند کر کے ہم تک پہنچائے۔ انہوں نے پشتو زبان و ادب کو ذریعہ اظہار بنا کر اس زبان کو فروغ اور تقویت بخشی۔

حضرت اخون درویزہ مہاجر عالم تھے، متقی انسان تھے۔ دین کے اس درجہ عاشق تھے۔

کہ اپنے فرزند عزیز کو کوہستان میں کفار کے خلاف جہاد میں بھیجا جہاں وہ راہ حق میں شہید ہو گئے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے ان کی طبیعت مائل بہ شدت تھی اور وہ چھوٹی سے چھوٹی بدعت پر بھی سخت گرفت کرنے والے تھے۔

حضرت اخون درویزہؒ نے طویل عمر پائی۔ زیادہ عرصہ یوسف زئی میں زندگی گزاری تاہم آخری دنوں میں پشاور آ گئے۔ انہوں نے یہیں وفات پائی۔ ان کا مزار پشاور شہر کے مشرق میں ہزار خوانی کے نواح میں مرجع خلافت ہے۔ خواتین کو مزار کے احاطہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ ان کی یہ کرامت آج بھی مشہور ہے کہ غبی اور کند ذہن بچے، جنہیں قرآن حفظ کرنے یا ناظرہ پڑھنے میں وقت محسوس ہوتی ہو۔ اگر ان کے مزار اقدس پر تین بار پانچ باریاسات بار جمعرات کو حاضر ہو کر قرآن خوانی کریں تو اللہ کی ہر بانی سے ان کا حافظ کھل جاتا ہے۔

۲ حضرت مولانا محمد گجراتی | حضرت مولانا محمد گجراتی کا شمار بھی حضرت پیر بابا

کے ماذون حضرات میں ہوتا ہے۔ عالم فاضل

انسان تھے۔ فقہ پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔ اپنے اوصاف حمیدہ اور اعمال پسندیدہ کی وجہ سے حضرت کے خلفاء میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

۳ حضرت مولانا عبد الکریم شہید بابا | اخون درویزہ علیہ الرحمۃ کے فرزند رشید

مولانا عبد الکریم اپنے نامور والد کی طرح

عالم فاضل انسان تھے اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے ہر وقت مستعد اور کمر بستہ رہتے تھے۔ انہوں نے پیر بابا کی خدمت میں رہ کر فیض پایا اور طریقت کی تکمیل کی۔ جب کفار کوہستان کے خلاف جہاد کی نوبت آئی تو بھی اخون عبد الکریم پیش پیش رہے اور راہ خدا میں شہادت پائی۔ ان کا مزار شریف کاجور سوات کے علاقہ نیک پی میں مرجع خاص دعاء ہے۔ وہ شہید بابا کے لقب سے مشہور ہیں۔

۴. حضرت مولانا ابابکر دانشمند سپہاڑی | حضرت مولانا ابابکر دانشمند سپہاڑی  
عابد و زاہد، متقی اور عالم با عمل شخص

تھے۔ اکثر گوشہ نشین رہتے تھے۔ علم تصوف کے اسرار و رموز میں بیکتا سے روزگار تھے، ان کی ساری زندگی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں گزری۔ بڑی قابل قدر ہستی تھے۔

۵. حضرت مولانا صالح الکوڑی | حضرت مولانا صالح الکوڑی علیہ الرحمۃ بھی  
عالم کامل اور ناضل بے بدل انسان تھے۔

اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے کافی عرصہ قندلمار کے قاضی حکومت ہے، مرشد کامل کی تلاش میں نکلے تو کافی مشکلات سے دوچار ہونے کے بعد بالآخر حضرت پیر بابا کی خدمت میں پہنچے اور پھر یہیں کے ہوئے، پیر بابا سے بیعت اور اجازتِ طریقت کے بعد دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ عمر کے آخری حصے میں ان پر مجدد و بانہ رنگ غالب رہا۔ ان کا مزار شریف موضع شبناڈی (علاقہ بونیر، سوات) میں زیارت گاہ خواص و عوام ہے عام طور پر وہ دیوانہ بابا کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

۶. حضرت ملا یوسف بن الیاس | حضرت پیر بابا کے ایک اور خلیفہ مجاز  
حضرت ملا یوسف بن الیاس گدائی زئی

ہیں جو عوام میں اخون یوسف کے نام سے مشہور ہیں۔ اخون کا لقب ظاہر کرتا ہے کہ وہ عالم ناضل انسان تھے اور شریعت محمدیہ کی پیروی میں پوری طرح کوشاں رہتے تھے۔ ان کا مزار موضع ملندری میں شرک کے کٹاے موجود ہے۔

۷. حضرت مولانا کابل گرام | حضرت مولانا کابل گرام بھی حضرت پیر بابا سے  
ماذوق تھے۔ تفصیل حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

ان کا مزار دریائے سندھ کے کنارے پر ہے۔

۸. حضرت مولانا تور بابا | مولانا تور بابا بھی رمز شناس طریقت اور عالم ناضل



شخص تھے۔ مزار موضع ایلی علاقہ بونیر ضلع سوات میں ہے۔

۹ حضرت اخون گدائی  
حضرت اخون گدائی بھی مرد میدان طریقت تھے اور  
حضرت پیر بابا کے مازون، مزار شریف میرہ

سالار زئی علاقہ بونیر سوات میں ہے۔

## اولاد

اللہ تعالیٰ نے جہاں پیر بابا سید علی غواص ترمذی کو اور بہت سی نعمتوں اور کامیابیوں سے نوازا وہیں انہیں اولادِ صالح سے بھی نوازا۔ صدیاں بیت جانے اور کئی نسلیں گزر جانے پر بھی ان کی اولاد دینی محبت اور دنیوی وجاہت دونوں میں ممتاز حیثیت کی مالک چلی آ رہی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں اس سادات گھرانے میں ایسے عظیم انسان جنم لیتے رہے جنہوں نے نہ صرف اپنے ہاں کی تاریخ میں نمایاں جگہ پائی سائے عالم اسلام میں بڑا نام پایا۔

پیر بابا سید علی ترمذی کے دو فرزند ان گرامی تھے۔ ایک کا نام سید حبیب ریاسید عبداللہ تھا جو نوجوانی ہی میں لاؤلفوت ہو گئے اور جن کا مزار اعلیٰ حضرت پیر بابا کے کے مرتد پرائوار کے ساتھ متصل واقع ہے۔ دوسرے صاحبزادے سید مصطفیٰ تھے جو ۹۷۲ ہجری بمطابق ۱۵۶۴ عیسوی کو پیدا ہوئے اور ۱۰۲۴ ہجری (مطابق ۱۶۱۵ عیسوی) کو وفات پا گئے۔ انہیں حکومت وقت کی جانب سے علاقہ کونٹر بلور سیری (جاگیر) ملا ہوا تھا لہذا وہ وہیں پر سکونت پذیر رہے اور ان کا مزار بھی وہیں پر موضع پشت میں مرجع خاص و عام ہے۔ کونٹر کی آبادی جلال آباد سے شروع ہو کر کافرستان رحپال تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ وادی بہت زرخیز ہے۔ اس میں دریائے کونٹر شمال کی طرف سے بہتے ہوئے آتا ہے اور ضلع ننکرہ میں دریائے کابل سے مل جاتا ہے۔

حضرت سید مصطفیٰؑ نے ان علاقوں میں اپنے والد گرامی حضرت پیر باباؒ کے مشن کو جاری رکھا اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شریعت کی تبلیغ میں ہر ممکن کوشش کی۔ افغانستان کے لوگوں کو ان سے مستفیض ہونے کا زیادہ موقع ملا اور یہ انہی حضرات کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اہل افغانستان قریباً سب کے سب حنفی مسلک کے پیروکار ہیں بلکہ جہادِ اسلامی کے پرچم کو بھی بلند رکھے ہوئے ہیں۔ ساہا سال سے وہ ایک بہت بڑی عالمی طاقت کے خلاف جان و مال کی قربانی دے رہے ہیں۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش آنے نہیں پائی۔

حضرت پیر باباؒ اور ان کے اخلاف کی انہی اسلامی خدمات کی وجہ سے ان سارے علاقوں میں ان کی اولاد بڑے عزت و احترام کی مالک ہے۔ یہاں تک کہ امیر صیب اللہ خان کے زمانے تک کابل کے سلاطین و حکمران اسی جذبہ عقیدت کے پیش نظر اپنی بیٹیاں تبرکاً اور تین سادات کونٹر کے اس گھرانے میں بیاہ دینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے رہے۔ چنانچہ امیر کبیر دوست محمد خان (بابائی خاندان محمد زئی) کی بہنیں اور بیٹیاں ان سادات کے گھروں میں تھیں۔

حضرت سید مصطفیٰؑ اپنے والد بزرگوار حضرت پیر باباؒ کے صحیح مسند نشین اور صاحب کشف و کرامات ہستی تھے، اللہ نے انہیں تین بیٹے عطا کئے۔ (۱) سید عبدالوہاب ر عرف میا عبدالبابا، سید قاسم اور سید حسن، کونٹر کا علاقہ بڑے صاحبزادے سید عبدالوہاب کو ورثہ میں ملا جبکہ بونیر وغیرہ کی املاک دوسرے دو فرزندوں کے حصے میں آئی۔ یہ سبھی حضرات جہاں خاندانی وجاہت، شجاعت، سخاوت و دیانت کی خوبیوں سے مالا مال تھے وہیں علم و فضل اور باطنی کمالات میں بھی اوج کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔

سید عبدالوہابؒ اور سید قاسمؒ کے گیارہ گیارہ بیٹے تھے۔ جبکہ سید حسنؒ کے دو ہی فرزند تھے۔ پہلے دونوں حضرات کی اولاد بہت کثرت سے ہے۔ سید حسن صاحبؒ کی اولاد اگرچہ کم ہے

لیکن بڑی معزز اور متمول ہے۔

سید عبدالوہاب المعروف میاں عبدالباباؒ آپ مادرزاد ولی تھے۔ ولادت  
۹۹۹ ہجری بمطابق ۱۵۹۰ عیسوی

میں ہوئی۔ اگرچہ ان کی املاک زیادہ تر کونٹر میں تھی لیکن حضرت پیر باباؒ کے سجادہ نشین  
قرار پانے پر انہوں نے بونیر کے مقام شلبانڈی ہی میں سکونت اختیار کی اور اسی جگہ ۱۰۶۳ھ  
ر بمطابق ۱۶۵۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔ انہیں شلبانڈی ہی میں سپرد خاک کیا گیا جہاں  
ان کا مزار مبارک زیارت گاہ خواص و عوام ہے طریقت کا سلسلہ انہی سے چلا اور وہ مریدوں  
کی باطنی تربیت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ یہ بات زبان زد عوام ہے کہ اخون درویزہ باباؒ کو  
ترقیات روحانی کا بڑا حصہ ان سے حاصل ہوا تھا۔ لیکن حقیقت میں انوار باطنی کا یہ حصہ  
اخوند سالاک کو ملا تھا (لفظ اخوند سے بجائے سالاک کے درویزہ مشہور ہو گیا)

سید عبدالوہابؒ نے اپنے جد امجد پیر باباؒ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے کفار کو ہستان  
کے خلاف جہاد کی مہم کا انتظام کیا۔ اس جہاد کی قیادت اخون سالاک نے کی۔ جب یہ کام پایہ  
تکمیل کو پہنچ گیا تو کوہستان سوات کے کفار کے خلاف سید قاسم کی نگرانی میں جہاد کا آغاز  
ہوا۔ سید حسن بھی اس مہم میں پیش پیش رہے۔ اس طرح کفار کی ایک کثیر تعداد دائرہ اسلام  
میں آگئی۔ کفار کا زور ٹوٹ گیا اور اسلام کا بول بالا ہوا۔ اس طرح ان حضرات نے سید علی ترمذی  
ر پیر باباؒ کی وصیت پر عمل درآمد کر کے دکھا دیا۔

یہ عظیم کارنامہ بجالانے پر سید عبدالوہاب اور ان کے برادران گرامی میں سے ہر  
ایک کو "صاحب تیغ اور صاحب دیگ" کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو یہ حضرات جہاد  
بالکفار میں پیش پیش رہے اور دوسری طرف مریدوں اور عام مسکینوں لئے وسیع لشکر  
بھی جاری کیا۔ یہ دونوں ذمہ داریاں پوری کرنے پر مسلمان عوام ان کی بڑی قدر  
و منزلت کرتے ہیں۔

## سید جمال ابن سید عبدالوہاب

سید جمال ابن سید عبدالوہاب کو بڑا بھائی ہونے کی حیثیت میں کونٹر کی

جاگیر عطا ہوئی تھی اس لئے وہ وہیں سکونت پذیر ہے۔ اُن کے چھ بیٹے تھے جن میں سے بڑے صاحبزادے سید عباس نے بڑا نام پایا..... کونٹر کی جاگیر انہی کی تحویل میں گئی اور سجادہ نشینی بھی انہی کے حصے میں آئی تھی..... لوگ ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے..... کونٹر کے سادات ترمذی کی اکثریت انہی سید جمال یا جمال الدین اول کی اولاد ہے جن میں سے سید عباس بابو جان بادشاہ سید محمود شاہ پاشا۔ سید جمال الدین افغانی، سید غلام پاشا، سید میر جان صاحب پاشا عرف شیخ پاشا بڑی نامور ہستیاں گزری ہیں..... یہ لوگ ساسے علاقہ کے دنیوی سربراہ بھی تھے اور دینی پیشوا بھی..... سید محمود شاہ پاشا کونٹر کے بادشاہ بھی ہے۔ اسی طرح سید جمال الدین افغانی جو سید عباس کی چوتھی پشت میں تھے، عالمی شہرت کے مدبر اور انقلابی رہنما تھے سید جمال الدین کے والد سید صفدر بھی خوبوں کے مالک تھے۔

سید جمال الدین افغانی کی حیات و تعلیمات پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان کی علمی قابلیت اور تدبیر کی وجہ سے امیر دوست محمد خان نے انہیں مصاحب اور مشیر اور اپنے بڑے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق مقرر کر رکھا تھا۔ بعد میں افغانستان کے سیاسی حالات کے پیش نظر انہیں وہاں سے ہجرت کرنی پڑی تو انہوں نے مسر، ترکی، ایران اور دوسرے ملکوں کا دورہ کر کے اتحاد بین المسلمین کی تحریک چلائی۔ انہوں نے مسلمانوں کو فرنگی سامراجوں کی سازشوں سے بچنے کو کہا اور اسلامی ممالک میں سامراجیوں کے خلائف مسلمان عوام کو منظم کیا..... انہی کی کوششوں سے انقلابی تحریکیں کامیاب ہوئیں اور مسلمان عوام میں جذبہ حریت بیدار ہوا۔

مشہور انگریز مستشرق اس جی براؤن کے الفاظ میں نعرہ بھی تھے اور سادہ قلب

بھی، خطیب بھی اور صحافی بھی، سب سے بڑھ کر وہ ایک ایسے بلند پایہ سیاستدان تھے جنہیں مسلمان بادشاہ اور فرنگی سامراج دونوں ایک خطرناک اور شورش پسند انقلابی سمجھتے تھے۔

**سید شاہ مرتضیٰ** | سید شاہ مرتضیٰ سید عباس بن سید جمال کے چھوٹے

بھائیوں میں سے ہیں۔ ان کی ایک ہمیشہ جو زہد و تقویٰ

میں رابعہ وقت مشہور تھیں، کی شادی سید حسن گیلانی قادری پشادری سے ہوئی۔ اسی پاکباز خاتون کے بطن سے سید شاہ محمد غوث لاہوری علیہ الرحمۃ جیسی یکتائے زمانہ ہستی تولد ہوئی جن کا مزار اقدس دہلی دروازہ کے باہر لاہور میں ہے اور جن کا شمار بلند پایہ روحانی بزرگوں میں ہوتا ہے۔ میران سرکار سید حسن بادشاہ قادری کا مزار پر انوار پشادری میں زیارت گاہ خواص دعوا ہے بی بی صاحبہ مذکورہ والدہ حضرت شاہ محمد غوث دہمیشہ سید عباس د شاہ مرتضیٰ ترمذی) کا مزار شریف بھی سید حسن بادشاہ قادری گیلانی کے مزار کے پہلو میں پشادری میں ہے۔

چونکہ سید شاہ مرتضیٰ کو کونٹر کی جائیداد سے کوئی حصہ نہ ملا تھا اور وہ بونیر کی املاک کے حصہ سے بھی محروم تھے، اس لئے انہوں نے علاقہ گدوون کے جدوونوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ ہزارہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ یہ واقعہ ۲۰ - ۱۹ء کا ہوگا۔ اس سے قبل سید جمال ابن سید قاسم بن سید عبدالویاب پھلی کا علاقہ فتح کر چکے تھے (تفصیلی ذکر آگے آئے گا) ان دنوں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر وفات پا چکا تھا اور مغلیہ حکومت رو بہ زوال تھی۔ پھلی سرکار پر جس میں اس وقت موجودہ ہری پور تحصیل کے میدانی علاقے بھی شامل تھے، سلطان محمود خوردا حاکم تھا جو ترک کہلاتا تھا۔ ترک حکمران خانہ جنگی میں مبتلا تھے اور ایسے میں جگہ جگہ مختلف ترک سرداروں (مسلمانوں) کا تصرف تھا۔ سلطان محمود ترک کے مرتے ہی حالات مزید خراب ہو گئے۔ ترک حاکم اکثر ظالم بھی تھے۔ اور عیاشی

بھی، لہذا عوام بھی انہیں ناپسند کرتے تھے.... ترک سلطان زادے باہم مشت و گریبان  
 رہتے تھے۔ ان خانہ جنگیوں میں سلطان محمود خور و کے دو بھائیوں سلطان مقرب خان اور  
 سلطان قیاس الدین زیادہ الجھے ہوئے تھے۔ کافی عرصہ تک دونوں بھائی آپس میں لڑتے  
 رہے، بالآخر سلطان مقرب خان والسی دھمتوڑ کا پد بھاری رہا اور قیاس الدین اپنا  
 سامنے کر رہ گیا۔ سلطان مقرب خان ہی سخت گیر انسان تھا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں  
 پر بڑے مظالم ڈھائے۔ لوگ اس کے خلاف وندے کر اور نگزیب عالمگیر کے پاس پہنچے  
 جس نے ان کی داد رسی کے لئے سلطان مبارز الدین گلکھڑ کو ہزارہ بھیجا۔ سلطان مقرب  
 خان کے رشتہ دار اس سے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے اس لئے اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔  
 کچھ دنوں تک تو سلطان مبارز الدین ہزارہ میں مقیم رہا۔ لیکن اس کی واپسی کے بعد حالات  
 اور بھی خراب ہو گئے اور دھمتوڑ کا علاقہ سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان کے  
 دو گھرانوں میں تقسیم ہو گیا۔

۲۰۔ ۱۷۱۹ عیسوی میں ان دونوں گھرانوں کے مابین خانہ جنگی کا سلسلہ ایک بار  
 پھر شروع ہو گیا اور ان کی برائے نام حکومت دم توڑتی نظر آنے لگی..... صورتحال  
 سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جدو جہدوں نے سید شاہ مرتضیٰ کی قیادت میں ہزارہ پر حملہ کر دیا۔  
 وہ علاقہ گدون سے چل کر دریائے سندھ کو عبور کر کے ہری پور پہنچے اور وہاں سے موجودہ  
 ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ انہوں نے اس علاقے کے پٹھان قبائل  
 سے کوئی تعرض نہ کیا البتہ ڈھونڈ، بے اور دوسری قوموں کو پہاڑوں کی طرف دھکیں  
 کر میدانی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں وہ جوہلیا کے راستے رجو عیہ سے ہوتے ہوئے  
 دھمتوڑ پہنچ گئے۔ ان دنوں سلطان اکبر خان دھمتوڑ کا آخری حاکم تھا۔ "تاریخ ہزارہ  
 کے مصنف میجر ویس کے مطابق وہ انتہائی عیاش شخص تھا۔ اس کی عیاش پرستی کا  
 یہ عالم تھا کہ اس نے دھمتوڑ میں ایک تالاب بنا رکھا تھا جس میں مرد عورتیں اکٹھے نہایا

کرتے تھے۔

سید شاہ مرتضیٰ کی اولاد میں یہ بات مشہور ہے کہ جب جدون کا لشکر دھمتور پہنچا تو سید شاہ مرتضیٰ کی اہلیہ محترمہ، جو نہایت صالحہ خاتون تھیں، ایک علیحدہ کمرے میں اندر سے کنڈی لگا کر بیٹھ گئیں اور کافی دیر تک دعا کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے جدون لشکر کو یہ حیلہ بتلایا کہ رات کی تاریکی میں ایک شخص جیل پر دو بوریاں رکھ کر گزرتے ہوئے بوریاں میں غلہ کی جگہ مٹی بھر دی جائے۔ جب وہ دھمتور شہر کے وسط سے گزرتا جائے تو شہر کے آخری حصے میں پہنچ کر ایک فائر دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف کر کے خود جیل کو ہانکتا ہوا باہر نکل جائے۔ ان دو فائرؤں سے ترکوں کے دونوں گزہ ہوں میں ایک دوسرے پر حملے کا شبہ کیا جانے لگا۔ تو وہ پہلے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیا سے تھے۔ اب رات ہی کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے، ساری رات باہمی کشت و خون کا سلسلہ جاری رہا صبح ہونے تک ان کے تقریباً سبھی لڑاکا لوگ ختم ہو چکے تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صبح دم جدونوں نے شہر پر دھاوا بول دیا اور بغیر کسی خاص مزاحمت کے دھمتور پر قابض ہو گئے۔

یہ ۱۷۲۰ عیسوی کا واقعہ ہے اس وقت جدون کا سربراہ نصیر خان پیر دخیل تھا۔ جبکہ لشکر کی قیادت سید شاہ مرتضیٰ کر رہے تھے۔ دھمتور کی تسخیر کے بعد جدونوں نے علاقہ ریش کے دیگر دیہات پر بھی قبضہ جمایا۔ اس طرح بگڑہ، بالڈھیر، حویلیاں، رجوعیہ، دھمتور، سلہڈ، جھنگی، کاکول، نواں شہر، میرپور سے بانڈہ پیر خان کے تمام دیہات ان کے تسلط میں آ گئے۔

جب یہ بہت تکمیل پذیر ہو گئی تو باہمی معاہدے کے مطابق جدون نے مفتوحہ علاقہ کا ایک چوتھائی پسندیدہ حصہ سید شاہ مرتضیٰ کی خدمات کے عوض انہیں دے دیا۔ باقی ماندہ علاقوں میں سے جدون قوم کے قبیلوں سالار، منصور اور حسن زئی میں برابر برابر تقسیم

کریئے گئے۔

اس حصہ رسدی کے علاوہ جدونوں نے پیر بابا کے شکرانہ کے طور پر خرمین سے ایک صاع غلہ سید شاہ مرتضیٰ کی اولاد کو نجوشی دنیا بھی منظور کر لیا۔ جدون قوم پیر بابا اور ان کی اولاد سے اتنی ارادت رکھتی تھی کہ غلہ میں سے یہ حصہ دنیا بھی پیر بابا کی اولاد کے دائمی حق کے طور منظور کر لیا گیا۔ انگریزوں کی آمد پر ۱۷۶۲-۱۷۶۰ء میں جب پہلا بندوبست اراضی عمل میں آیا تو بھی وفا شعار جدون قوم نے بندوبستی انگریزوں کے سامنے متفقہ طور پر تحریری بیان لے کر پیر بابا کا نذرانہ مثل حقیقت میں دسج کر لیا اور سادات کی اراضی بھی مستقلاً انہیں دے دی گئی اور سادات کو اس اراضی کے رہن، بیع کرنے کا مجاز بھی قرار دے دیا گیا۔ خود میجر ویس نے جدون قوم کے اس ایفائے عہد، دیانتداری اور ایمانداری کو بہت سراہا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اس نے سید جلال بابا کی اولاد کے ساتھ صوابتوں کے طرز عمل کو اخلاقی بد اعتمادی اور بدیانتی پر محمول کیا ہے۔

سید شاہ مرتضیٰ کو حسب تقسیم جو چوتھائی حصہ ملا تھا اس میں موانععات میرپور اور جھنگی وغیرہ شامل تھے۔ تاہم ان کی اولاد کثرت سے علاقہ ریش کے تمام دیہات (دھمٹوڑ، نواں شہر، کاکول، شیخ اباٹ، جھنگی، میرپور وغیرہ) اور جو عیہ، دکھن، بالڈھیرتی، بانڈی ڈھوڑاں، داتہ، اکھوڑہ اور پیرا خیر آباد میں آباد ہے۔

**سید مسعود بن سید عبدالوہاب** | سید مسعود بن سید عبدالوہاب چونکہ سید جمال جلال کے علاوہ رجو کوٹھریں آباد تھے

باقی تمام بھائیوں میں بڑے تھے اور بونیر کی مرکز گدھی کے سجادہ نشین تھے۔ اس کے انہیں تمام خاندان میں بڑی اہمیت حاصل تھی وہ اپنے والد ماجد کی طرح تمام افغانوں کے ذہنی اور روحانی پیشوا تھے۔ انہی کی تائید اور امداد سے ان کے عم زاد سید جلال بن سید تاسم نے ضلع نہارہ کا شمالی علاقہ فتح کیا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔



سید مسعود کے تیرہ فرزند تھے جن میں سے سید خواجہ احمد نور، جو ایک عالم فاضل انسان اور صاحب کشف و حال بزرگ تھے، سجادہ نشین فرار پاتے۔ ان کی میسرے پشت سے سید ضامن شاہ ایک بہادر اور مدبر حکمران ہوئے۔ ان سے سید ضامن شاہ ہی تھے جنہوں نے اپنا خانہ انی مرکز بونیر تنہا منتقل کیا اور محمد شاہ بادشاہ نے ان سے ہزارہ اور پھلی کی جاگیر سند حاصل کر کے علاقے کے حکمران بن گئے۔ ان کے پوتے سید اکبر شاہ نے مجاہدین سید احمد بریلوی کی ہر ممکن مدد کی۔ سید اکبر شاہ کو بعد میں سوات اور ہزارہ کے مسلمان عوام کے لئے امیر یا بادشاہ منتخب کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شہزادہ مبارک شاہ بھی چھ ماہ تک سوات کے بادشاہ رہے۔ پھر انھوں صاحب سوات کی ناراضگی کی وجہ سے وہ اس منصب پر فائز نہ رہ سکے۔

سید مبارک شاہ کو انگریزوں سے شدید نفرت تھی، اسی کی مشہور جنگ (۱۸۶۲ء) میں وہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والے سحر صدی مجاہدوں کے ہیرو تھے۔

سادات ستھانہ کے اسی خانوادہ میں پیر بابا کی بارہویں پشت میں ایک نہایت عالم و فاضل ہستی سید عبدالجبار شاہ (۱۸۷۱ء تا ۱۹۵۶ء) بھی ہوئے ہیں۔ وہ دو سال کے تھے کہ گھرانے میں خانہ جنگی کے سلسلے میں قتل مقامہ ہوا تاہم اللہ نے اس یتیم بچے کو محفوظ رکھا۔ بچپن میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعلیم پائی، ۱۸۹۹ء میں نواب امب محمد اکرم خان نے انہیں اپنا مشیر بنا لیا، ۱۹۰۷ء میں نواب خانی زمان خان نے انہیں اپنا سیاسی وزیر مقرر کیا۔ انہوں نے ریاست کو توسیع و ترقی دی۔ اپنے دشمنوں کو جس میں سید فیروز شاہ بھی تھا، مغلوب کیا مگر قتل نہ کیا، ۱۹۱۵ء میں انہیں لوگوں نے سوات کا بادشاہ منتخب کیا۔ تین سال بعد اس منصب سے معزول ہوئے تو دوبارہ نواب آف امب کے پاس وزیر رہے۔ ۱۹۳۶ء تک اس عہدے پر مامور رہے اور پھر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ انہوں نے ایک کتاب موسومہ ”عبقرۃ“ لادلی الابصار“ تصنیف کی ہے جس میں صوبہ سرحد اور قبائل علاقوں

کے تاریخی حالات کے علاوہ حضرت پیر بابا کے بارے میں مفصل کوائف ملتے ہیں۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ سید عبدالجبار شاہ کے فرزندوں کے پاس موجود ہے۔ اس کتاب میں بھی پیر بابا کے مصدقہ حالات کے سلسلے میں ان کی کتاب سے کافی استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ یہ حالات کسی اور ذریعہ سے ملنے ناممکن تھے۔ شاہ صاحب کا یہ کارنامہ فی الواقع قابل ستائش ہے۔

سید جلال بن سید قاسم رضی اللہ عنہما | سید جلال اور مراد خان حالات سے مجبور ہو کر سوات سے نکلے اور کشمیر جانے کا عزم کیا۔

راتے میں کچھ عرصہ مکھلی کے صدر مقام گلی باغ میں قیام کیا۔ مراد خان کے ہمراہ اس کا ایک بھائی مسمی بھائی خان بھی تھا۔ جب سلطان محمود خور دوالی مکھلی کو معلوم ہوا کہ کچھ معزز وہاں اس کے دارال حکومت میں آئے ہیں تو ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور انہیں بلا بھیجا۔ ان کے بے کسی اور پریشانی حالی کا سن کر اور یہ معلوم کر کے کہ وہ حضرت پیر بابا کے بابرکت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترک سلطان محمود خور نے ان کی بڑی قدر افزائی کی۔ اپنے پاس ٹھہرایا اور یہاں تک کہ اپنی بیٹی سید جلال کے عقد میں دے دی اور جہیز میں بھوگڑ منگ کا علاقہ انہیں عطا کیا۔ . . . . مراد خان کو اس نے اپنا مصاحب بنا لیا اور اس طرح ان گزشتہ زمانہ کے ستلے ہوئے لوگوں کو پھر سے مکھلی سرکار میں باوقار مقام حاصل ہو گیا۔ تاہم ترک سلطان محمود خور کی سید جلال اور مراد خان پر یہ عنایت خسروانہ اس کے اپنے عزیز واقارب کی آنکھوں میں خار بن کر ٹھٹھکنے لگی اور وہ موقع بموقع سلطان کے کان ان کے خلاف بھرنے لگے۔ ان کی باتوں میں آکر سلطان محمود سید جلال کو اپنی راہ کاوڑا سمجھنے لگا اور اپنی خفیہ پولیس کو حکم دیا کہ چکے سے سید جلال کا کام تمام کر دیں۔ سید جلال کو اس سازش کا کچھ علم نہ تھا۔ ایک دن وہ سلطان محمود سے ملنے بھوگڑ منگ سے گل باغ آ رہا تھا کہ سلطان کے لشکریوں نے ایک پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر اچانک حملہ کر دیا۔

سید جلال نے تلوار نکال لی اور مقابلہ کیا۔ لیکن اکیلے ان کی پیش نہ گئی۔ انہیں تلواروں اور نیزوں کے کئی زخم آئے۔ حملہ آور یہ سمجھ کر کہ وہ ختم ہو چکے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر چلتے بنے۔ زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود سید جلال نے حوصلہ نہ ہارا۔ گھوڑے کو اڑھ لگائی اور اپنے قلعہ تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ وفا شعار بیوی انہیں خون میں نہائے ہوئے دیکھ کر سارا ماجرا سمجھ گئی۔ اس نے انہیں قلعہ کے ایک کمرے میں لٹا دیا اور ان کی مرہم پٹی کرتی رہی۔ تاہم اس نے کسی کو کانوں کا اس واقع کی خبر نہ ہوتے دی نہ کسی کو سید جلال کے کمرے تک پہنچنے دیا۔ رفتہ رفتہ سید جلال کے زخم بھرتے گئے اور وہ صحت یاب ہو گئے۔ سفر کے قابل ہوتے ہی وہ راتوں رات خفیہ طور پر مکھلی کے علاقے سے نکل کر اپنے عم زاد بھائی سید مسعود کے پاس تختہ بند (بوسیر) پہنچے اور امداد کے طالب ہوئے۔ سید مسعود چونکہ پیر بابا کی مرکز کی گدی کے جانشین اور صاحب جاہ و جلال تھے۔ اس لئے انہوں نے سید جلال کی منظوری کی داستان سن کر اسے ہر طرح کی امداد کا یقین دلایا۔ سید مسعود بڑے مدبر انسان تھے۔ یوسف زئی اور غوریا خیل ان کی آواز پر لبیک کہتے تھے، اس کے علاوہ انہوں نے ان سواتیوں کو بھی جمع کیا جنہیں یوسف زئی اور دوسرے طاقتور قبیلوں نے اپنے علاقوں سے نکال دیا تھا اور وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ انہوں نے سب کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ مکھلی پر چڑھائی کر دیں۔ اللہ نے فتح دی تو مکھلی کی حکومت سید جلال کے سپرد ہوئی جبکہ شکست خوردہ ترکوں کی تمام اراضی پیرواتی مالک و قابض قرار پائیں گے۔ اس پر سواتیوں نے دل و جان سے سید جلال کا ساتھ دیا۔

ادھر مکھلی کے ترک حکمران اس وقت باہمی خانہ جنگیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ سلطان محمود اپنے بھائی بندوں سے تنگ آچکا تھا اور وہ ان کی شرکایت کرنے شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے پاس دہلی گیا ہوا تھا۔ اسے مکھلی میں ترک باہم دست و گریبان تھے۔ علاقہ داران میں سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان ایک دوسرے کو مٹانے کے لیے

علاقہ تناول میں سلطان قیاس الدین (برادر سلطان محمود) اپنی من مانی کر رہا تھا۔ علاقہ مظفر آباد میں کمال خان خود سر ہو گیا تھا۔ گلی باغ میں سلطان محمود کے دو چھوٹے بیٹے مرید خان اور عاقل خان اپنے مشیر کار مراد خان کی رہنمائی میں لوٹ کھسوٹ میں لگے تھے، سلطان فضل خان اور ملوک خان میدان ہزارہ قارلق کے کسی دیہات پر قبضہ جما چکے تھے، سلطان پور اور مانکراے میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ اس طرح بکھلی کے ترک حکمرانوں نے طوائف الملوکی مچا رکھی تھی۔ نہ کوئی مرکزی نظام تھا نہ وہ بکھلی سرکار سے دتے تھے۔ سید جلال چونکہ ایک عرصہ بکھلی میں وقت گزار چکا تھا اس لئے اس صورت حال سے بخوبی باخبر تھا۔ وہیں اس کے دیرینہ دوست مراد خان اور بھائی خان بھی موجود تھے۔ لہذا اس نے اپنے لشکر کو لے کر دریائے سندھ عبور کیا اور بکھلی کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ مراد خان نے دوست پروری کا ثبوت دیتے ہوئے سلطان مرید خان اور سلطان عاقل خان (وارثان شاہ محمود) کو جنگ سے باز رکھا اور چپکے سے قلعے سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ یہ شہزادے اپنی خواتین اور بچوں کو لے کر علاقہ کونش میں روپوش ہو گئے جس پر سید جلال نے بغیر کسی مزاحمت کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ قلعہ پر سید جلال کے قبضہ کی خبر سنتے ہی ترک لشکر لوہے نے گلی باغ چھاؤنی کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن ان کی کوئی پیش نہ چلی۔ اس لڑائی میں گلی باغ جل کر راکھ ہو گیا۔ پھر صواتی لشکر نے بھی گلی باغ اور بیداری میں خوب لوٹ مار مچائی۔ اس طرح ۱۷۱۳ء کو بکھلی سے ترک اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور دریائے سندھ کے مغرب اور مشرق دونوں طرف حضرت پیر بابا کے خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔ مغرب میں سید مسعود اور مشرق میں سید جلال دینی پیشوا بھی تھے۔ تو دنیوی حکمران بھی . . . . . اس فتح کے بعد حملہ آوروں میں کچھ تو انہی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ جبکہ کچھ واپس اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

بکھلی کی فتح کے بعد سید جلال اور مراد خان نے علاقے کی تقسیم کر لی۔ سید جلال نے

وادئی کاغان اپنے پاس رکھی اور باقی علاقہ مراد خان کے تصرف میں دے دیا۔ یاد ہے کہ

کاغان کا علاقہ اس سے پیشتر کپھلی سرکار میں شامل نہ تھا۔ بعد میں سید جلالؒ کے فرزند ارجمند نے رجوغازی باباؒ کے لقب سے مشہور رہیں (کاغان کے نواحی کوہستانی علاقوں اور چیلاس کے کفار سے جہاد کیا اور نہ صرف ہزاروں لوگوں کو مشرف باسلام کیا بلکہ سائے علاقے میں اپنی عملداری قائم کر لی۔۔۔۔۔۔ قبل ازیں دریائے سندھ کے مغربی کوہستانی علاقے حیرال، دیر، کوہستان، بونیر بھی پیر باباؒ اور ان کے خلفاء اور اولاد کے ماتحتوں فتح ہو چکے تھے۔ اب ہزاروں مربع میل پر پھیلے ہوئے ان تمام وسیع و عریض علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور لوگ دھڑا دھڑا ترہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔

تاریخ ہزارہ کے مؤلف میجر ویس کے مطابق صواتیوں نے اپنے غلہ (خرمن) سے ایک چوتھائی حصہ سید جلالؒ اور ان کی اولاد کو دینے کا وعدہ کر رکھا تھا لیکن بعد میں وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ اس طرح نہ صرف وہ وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے بلکہ انہوں نے سادات کی املاک بھی ان سے چھین لی۔

سید جلالؒ گلی باغ اور کپھلی کی تسخیر کے تھوڑا عرصہ بعد وفات پا گئے۔ ان کا مزار موضع ڈگ میں اب بھی زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔

حضرت پیر باباؒ کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیوی برکات سے نوازا اور وہ کاغان کپھلی اور اگرورد وغیرہ کے سادات زیادہ تر انہی کی پشت سے ہیں۔ انہوں نے دین کا پرچم بلند کئے رکھا اور مقامی لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ علاوہ ازیں دنیوی وجاہت اور امارت میں بھی انہیں وافر حصہ ملا۔ وہ بڑی بڑی جاگیروں اور املاک کے مالک تھے۔ ان میں سے کسی لوگ سجادہ نشین اور رہنمائے طریقت بھی تھے۔ جبکہ دوسرے لوگ جہاد آزادی میں حصہ لینے اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے، سائے علاقہ میں آج بھی انہیں انتہائی عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

سید پانڈہ شاہ المعروف چٹری باباؒ | سید پانڈہ شاہ المعروف چٹری باباؒ

علیہ الرحمۃ حضرت پیر باباؒ کی گیارہویں پشت میں سے ہیں۔ ان کی ساری زندگی بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف رہی۔ جس طرح خود پیر بابا علیہ الرحمۃ نے اپنے مرشد گرامی کی ہدایت پر اپنے آپ کو کوہستانی علاقوں میں تبلیغ دین کے لئے وقف کر دیا۔ اسی طرح ان کی اولاد بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دشتوار گزار پہاڑی علاقوں میں آباد ہوئی۔ اس خانوادے کے ایک عظیم فرد سید محبوب شاہؒ نے اسی سلسلہ میں موضع خوازہ حیلہ (سوات) کو اپنا مسکن بنایا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنے کا مشن جاری رکھا۔ بعد میں ان کے صاحبزادے سید مبارک شاہ صاحبؒ نے بھی تبلیغ دین کی خاطر شانگلہ پارکے ایک چھوٹے سے گاؤں غور بند میں سکونت اختیار کر لی۔ سید محبوب شاہؒ اور سید مبارک شاہ دونوں کے مزارات اسی موضع غور بند میں موجود ہیں.....

حضرت سید پانندہ شاہ المعروف چٹری بابا اسی مقام پر سال ۱۲۶۳ ہجری (مطابق ۱۸۴۷ء) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ان میں ولایت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ دنیا سے لاتعلق اور اللہ اور رسولؐ کی محبت میں مست و سرشار رہتے۔ چونکہ یہ گھرانہ ظاہری اور باطنی علوم دونوں میں ممتاز مقام کا مالک رہا ہے۔ اس لئے اپنی خاندانی روایت کے مطابق سید پانندہ شاہ نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی سے حاصل کی جو ایک نامور عالم دین اور مدرس تھے اور جن سے ہزاروں طالبان دین نے اکتساب فیض کیا۔ فقہ کی ابتدائی کتابیں اپنے برادر بزرگ سے پڑھنے کے بعد سید پانندہ شاہ کچھ عرصہ بغیر تعلیم سوات میں بھی مقیم رہے۔ حصول علم کے ساتھ ساتھ وہ ذکر و فکر الہی میں مصروف رہتے۔ اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے جب بھی موقع ملتا اپنے جد امجد، سلطان الاولیاء، غوث زمان حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے مزار شریف پر حاضری دیتے اور کئی کئی دن وہاں قیام کر کے عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ اکثر وہیں پر چلہ کشی بھی کیا کرتے..... ایک بار تو پورے ڈیڑھ سال تک انہوں نے پیر بابا کے مزار پر چلہ کاٹا..... اس چلہ کے دوران خواب میں انہیں اعلیٰ حضرت

پیر بابا کی زیارت نصیب ہوئی جنہوں نے سید پانندہ شاہ کو تاکید کی کہ وہ اپنے بزرگوں کے طریقے کو قائم رکھیں۔۔۔۔۔ اور کوہستان کے دور دراز علاقوں میں لوگوں کے اصلاح احوال پر توجہ دیں۔ ان دنوں کوہستانی علاقوں میں بد امنی اور قتل و غارت کا دور دورہ تھا اور لوگ اسلامی تعلیمات سے بالکل نا آشنا تھے۔

اپنی روحانی پاکیزگی کی بدولت حضرت چٹری بابا کو اپنے علاقہ میں بھی بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دور دراز علاقوں کے علمائے کرام بھی بعض مسائل کے حل کے سلسلے میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کوہستان کے سرکردہ لوگوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارکانِ وفد نے ان سے استدعا کی کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے ان کے ہاں تشریف لے جائیں تاکہ لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں مدد ملے۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا کہ وہ حضرت کے ارادت مندوں اور مہانوں کے لئے رہائش اور لشکر کا انتظام بھی کرنے کو تیار ہیں۔ حضرت چٹری بابا ان لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ وہی کوہستانی علاقہ ہو جہاں جانے کی تاکید حضرت پیر بابا نے انہیں خواب میں کی تھی۔ آپ نے اس بارے میں اپنے عزیز واقارب سے بھی مشورہ کیا اور بالآخر اس کوہستانی علاقہ کو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس علاقہ کا نام چٹرائی ہے۔ یہ خطہ چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ سطح سمندروں سے سات آٹھ ہزار فٹ اونچا ہونے کی وجہ سے موسم سرما میں یہاں بہت برف پڑتی ہے جو کسی کسی ماہ تک پہاڑی چوٹیوں پر جمی رہتی ہے۔ بعض اوقات برفانی توفے گلیشیر کی صورت میں پہاڑوں سے سرک آتے ہیں تو سائے علاقے میں سیلاب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور آمد و رفت رک جاتی ہے۔ گلیشیر کے گرنے کی آوازیں بڑی ہیبت ناک ہوتی ہیں۔ چونکہ اس سیلاب کو پشتو میں چٹری کہا جاتا ہے اس لئے اس سائے علاقے کا نام بھی چٹری پڑ گیا ہے اور علاقے کی مناسبت سے سید پانندہ شاہ صاحب کو بھی چٹری بابا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سید پانندہ شاہ بابا کے وہاں جانے سے لوگوں میں پھر اسلامی جوش اور جذبہ نمودار  
آیا۔ اپنی تبلیغ اور اپنے نفس گرم سے انہوں نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی، لوگ  
ان کے ظاہری اور باطنی علوم سے فیض یاب ہوئے۔ بدامنی کی جگہ امن نے اور فضولیات  
کی جگہ اعلیٰ اخلاقی قدروں نے لے لی۔ آپ کے ہاں روزانہ ختم خواجگان پڑھا جاتا اور ذکر و  
تکر کی مجلسیں برپا ہوتیں۔

بچپن سے ہی عمر تک آپ سہمہ تن تبلیغ دین کی طرف متوجہ رہے اور تہجد کی زندگی  
سبر کی۔ پھر سنت نبوی پر عمل کرنے کی غرض سے مشہور ولی اللہ عالم دین اور شہسوار شاعر  
حافظ اپوری کی ایک نواسی سے جو انتہائی پاک دامن خاتون اور حافظہ قرآن پاک تھی نکاح  
کیا۔ آپ کی عادت تھی کہ اکثر حضرت پیر بابا کے مزار مبارک پر حاضری دیا کرتے تھے۔ چورانوے  
سال کے تھے کہ خواب میں حضرت پیر بابا نے انہیں حکم دیا کہ وہ مزار مبارک سے ملحقہ مسجد کی تعمیر نو  
کرائیں اور اس کی تزئین و آرائش کی جانب متوجہ ہوں۔ اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے  
چٹری بابا کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ یہ کام انجام دیں تاہم چونکہ اپنے جد امجد پیر بابا کا فرمان  
بجالانا ضروری تھا۔ اس لئے وہ ۱۹۳۸ء میں بویر آئے، تمام سادات کرام اور معززین علاقہ  
کا بہت بڑا جرمہ بلایا اور ان سے مسجد کی تعمیر نو کے لئے تعاون کی درخواست کی۔ تمام لوگوں  
نے ان کی اپیل پر آمنا و صدقنا کہا۔ چونکہ ان دنوں سوات اور بویر میں ریاستی نظام تھا  
اس لئے آپ والی سوات میاں گل عبدالودود صاحب کے پاس اجازت لینے سید و شریف  
گئے۔ والی صاحب بھی حیران ہوئے کہ اس ضعیف اور بے سروسامانی میں ان سے آنا بڑا کام  
کیسے انجام پائے گا۔ تاہم چٹری بابا نے کہا "منصوبہ سنی کمیٹی اللہ تعالیٰ خود کرے گا۔ مسجد  
انشاء اللہ ضرور بنے گی۔ آپ حاکم وقت ہیں، اجازت ضروری ہے۔ آپ صرف اجازت نامہ لکھ  
دیں۔ بادشاہ صاحب سوات نے صرف اجازت نامہ لکھ دیا بلکہ اپنے کارکنوں کو بھی آپ کی مدد  
کے لئے بھیجا۔ ۱۹۴۰ء میں اس عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔۔۔۔۔ یہ وہ دن تھے جب



دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے سینٹ، سربراہ اور دوسرا عمارتی سامان دستیاب ہونا بھی مشکل تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضرت چٹری بابا کی برکت اور ان تھک کوشش سے تعمیری کام جاری رہا۔ ابھی دو بڑے میناروں پر کام ہو ہی رہا تھا کہ چٹری بابا علیٰ عیسیٰ ہو گئے۔ کچھ عرصہ سید شریف کے ہسپتال میں ان کا علاج ہوتا رہا لیکن بالآخر موت کا بلاوا آ گیا اور ۱۳۶۸ھ میں وہ اس دار فانی سے رخصت ہو کر اپنے مولائے حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔

حضرت چٹری بابا کا مزار اس رنج الشان مسجد کے مشرق میں واقع ہے جو اپنی تعمیر کے لحاظ سے بڑا خوبصورت اور دلکش ہے، ہر روز سینکڑوں لوگ وہاں حاضری دیتے اور سلام پیش کرتے ہیں۔

حضرت چٹری بابا کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین حضرت سید معین الدین شاہ صاحب نے مسجد کی تعمیر و تزئین کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ انہوں نے حضرت پیر بابا کے روضہ کی توسیع و آرائش میں بھی گہری دلچسپی لی اور مزار پر ملحق ایک دینی درس گاہ بھی تعمیر کرائی۔ درس گاہ ۱۹۷۰ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں ہر وقت ساٹھ ششتر طلبائے دین تعلیم پاتے ہیں۔ ان کی خوراک رہائش اور اساتذہ کرام کے مشاہروں کا اہتمام درگاہ پیر بابا کے سجادہ نشین حضرات برداشت کرتے ہیں۔ زائرین کرام اور نادار مسافروں کے لئے نگر شریف کا بھی انتظام ہے۔ اسی سال ۱۹۸۶ء عیسوی (بمطابق ۱۴۰۶ھ) کو سید معین الدین شاہ بھی انتقال فرما گئے تو ان کی جگہ ان کے بڑے صاحبزادے سید حسین شاہ صاحب طال اللہ عمرہ کو درگاہ پیر بابا سید علی خواص ترمذی علیہ الرحمۃ کا سجادہ نشین مقرر کیا گیا۔ اس طرح چار سو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا ہے لیکن اللہ کے ایک نیک بندے اور عظیم روحانی پیشوا حضرت پیر بابا کا جاری کیا ہوا مشن کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

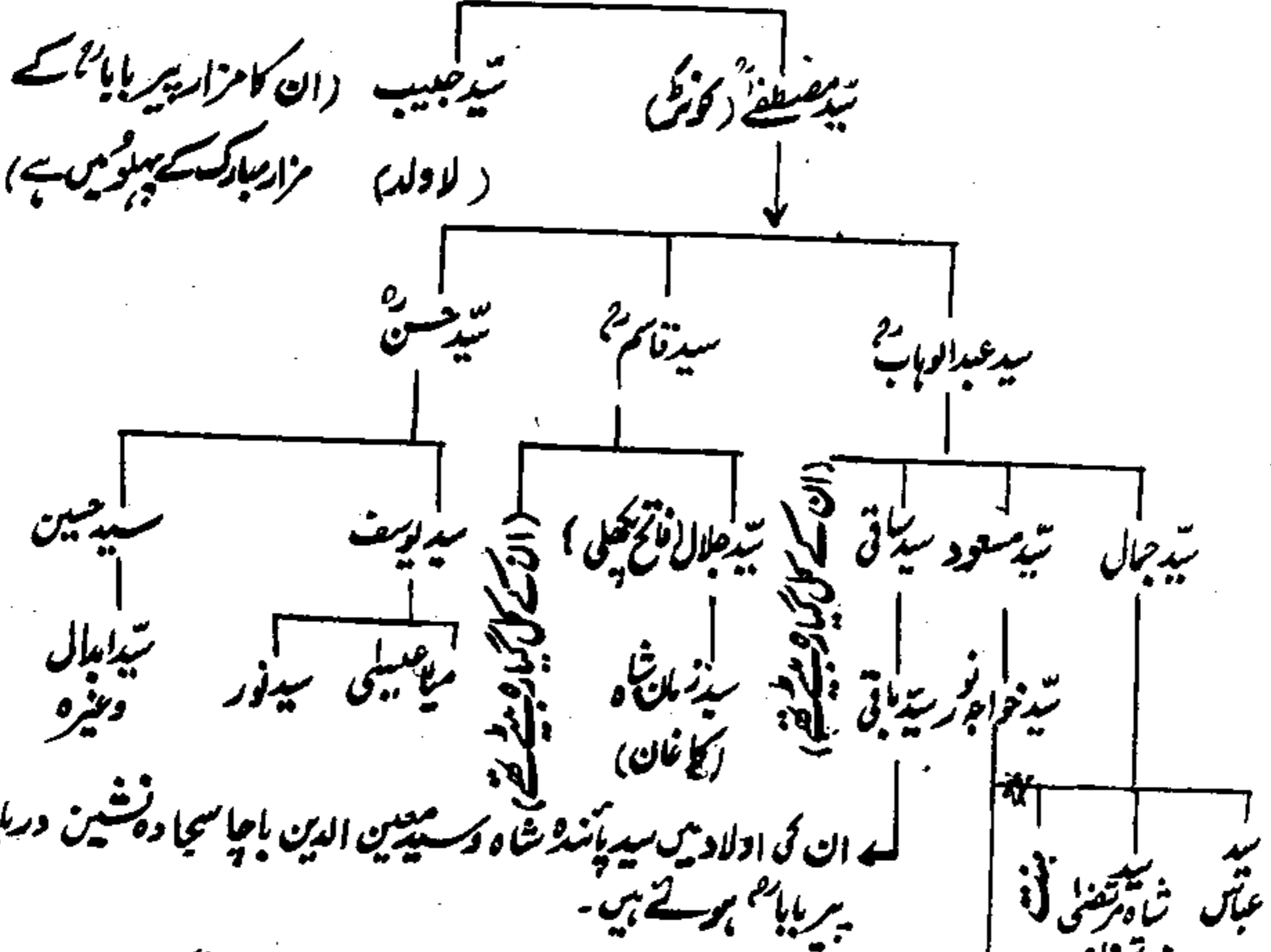
**پیرا بی** | بی بی مریم ملینرٹی "المعروف پیرا بی نہایت پرہیزگار، پاک دامن عابدہ اور صالحہ خاتون تھیں۔ وہ بڑی مستجاب الدعوات اور عظیم ہستی تھیں۔ ان کا مزار

حضرت پیر بابا کے مزار سے جنوب کی طرف تقریباً تین میل کے فاصلے پر پیر بابا ڈگر روڈ کے کنارے زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ حضرت پیر بابا کے سلام کو جانے والے اکثر زائرین وہاں بھی حاضری دیتے اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

پیر بابا کے مزار کے اردگرد کافی آبادی ہے ہوٹل اور دکانیں ہیں۔ مزار مبارک تک سڑکیں بچی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا معقول انتظام ہے۔ اسی لئے زائرین کو کوئی تکلیف پیش آنے نہیں پاتی۔

## مختصر شجرۂ اولاد

سید علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا (بونیری)



ان کی اولاد میں سید پاندہ شاہ و سیدین الدین باچا سجادہ نشین دربار پیر بابا ہوتے ہیں۔

ان کی اولاد سے سید اکبر شاہ وغیرہ بادشاہ صوات و ہزارہ ہو گئے ہیں

یہ فاتون زہد و عبادت میں رابعہ عشر مشہور تھیں حضرت سید حسن بادشاہ گیلانی قادری کی زوجہ اور حضرت شاہ محمد عوث لاہوری کی والدہ تھیں۔ ان کا مزار چاوری

حضرت سید حسن گیلانی المعروف میراں سرکار کے مزار مبارک کے پہلو میں مرجع خلائق ہے

ان کی اولاد کا سلسلہ چاہیٹوں سید عبدالقادر المعروف صاحبزادہ بابا، سید جلال، سید علی المعروف شاہ جی بابا، سید ولی سے جاری ہے اور تمام مزارہ خصوصاً ضلع ایبٹ آباد میں کثیر تعداد میں پھیلی ہوئی ہے

ان کی اولاد کثرت سے افغانستان (کونڑ وغیرہ) میں آباد ہے۔ بڑی بڑی صاحب علم و فضل و

صاحب وقار ہستیاں ان میں گذری ہیں سید محمود شاہ وغیرہ بادشاہ ہوتے ہیں۔ انہی میں نابغہ عصر

سید جمال الدین افغانی بین الاقوامی شہرت سے حامل ہوتے ہیں۔

# سلاسل طریقت

سلاسل طریقت اعلیٰ حضرت غوث زمان سید علی ترمذی رپر بابا چودہ  
 خاندانوں اور سلسلہ جات طریقت میں شرفِ اذن و ارشاد سے ممتاز تھے جن میں سلسلہ  
 کبرویہ و سلسلہ قادریہ کی اذن و اجازت اپنے جدِ بزرگوار حضرت سید احمد نور علیہ  
 سے حاصل ہوئی تھی اور باقی سلسلہ جات جو باہم دیگر پیوستہ ہیں، ان کی اجازت  
 حضرت شیخ سالار عطار اللہ رومی علیہ الرحمۃ سے ملی تھی، جن کی تفصیل یہ ہے :  
 چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ، ناجیہ حلاجیہ، زیدیہ، ادھیمنہ، ابو ہریرہ،  
 عجیبیہ، داودیہ، کرخیہ، سقطیہ، اور فردوسیہ  
 چار مشہور سلاسلِ چشتیہ، سہروردیہ، کبرویہ و قادریہ کے شجرہ جات  
 درج ذیل ہیں۔

## شجرہ سلسلہ چشتیہ

الہی بکرمت سیدنا مولانا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
 الہی بکرمت سیدنا اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ عبدالاحد بن زید رحمۃ اللہ علیہ

الہی بکرمت حضرت خواجہ نقییل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ سلطان ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ خذیفہ مرعشی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ ہبیرہ بصری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ مشاد علودنیوری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ ابواسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ احمد ابدال چشتی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ قدوۃ الدین ابو محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ تطیب الدین نووود چشتی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ عثمان ہاردنی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ فریب نواز سید معین الدین سجری (اجمیری) چشتی  
 رحمۃ اللہ علیہ۔

الہی بکرمت حضرت خواجہ قطب الدین بختیاراوشی (کاک) رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ علاؤ الدین عمر اسد اللہ نوری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ نور قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ

الہی بکرمیت حضرت خواجہ سید حامد الدین رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ بہاؤ الدین عمامت رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ سالار عطار اللہ رومی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت شہنشاہ خراسان غوث زمان اعلیٰ حضرت سید علی خواص ترمذی  
 رپر بابا، رحمۃ اللہ علیہ

### سلسلہ سہروردیہ

الہی بکرمیت سیدنا و شفیقنا دمولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم  
 الہی بکرمیت سیدنا باب مدینہ علم حضرت علی کرم اللہ وجہہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ سبزی سقطی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ مشاد علود نیوری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ احمد اسود علود نیوری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ محمد عمویہ بن عبد اللہ سعد سہروردی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ وجیہ الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ صدر الدین عارف رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

الہی بکرمت حضرت خواجہ سید جلال الدین مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ فخر الدین محبوبی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ نظام الدین ہاجری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ قطب الدین ہاجری رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ سالار عطار اللہ رومی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت غوث زمان شہنشاہ خراسان حضرت سید علی خواص ترمذی المعروف  
 پیر بابا (ربویری) رحمۃ اللہ علیہ۔

### سلسلہ کبریٰ

الہی بکرمت سیدنا شفیعنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
 الہی بکرمت سیدنا اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ  
 الہی بکرمت سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 الہی بکرمت سیدنا حضرت امام علی زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 الہی بکرمت سیدنا حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 الہی بکرمت سیدنا حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 الہی بکرمت سیدنا حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 الہی بکرمت سیدنا حضرت امام علی رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے متشعبہ یہ سلسلہ بھی جاری ہے جس کا فیض ان  
 کو اپنے نانا حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہم سے اور ان کو حضرت سلمان  
 فارسی رضی اللہ عنہ سے اور ان کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کو حضرت  
 اساتیب سید المرسلین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہنچا تھا۔

- الہی بکرمت حضرت خواجہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ بیری سقطی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ ابو علی رودباری رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ ابو علی کاتب رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ ابو القاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ ابو بکر نساج رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ احمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ ابو نجیب عبدالقاسم سہروردی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ عمار یاسر رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ نور الدین عبدالرحمان رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ رضی الدین علی لالا رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ بہاؤ الدین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ علاؤ الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ محمود مزدقانی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ امیر کبیر علی بہدانی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ ابواسحاق ختلانی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ سید نور بخش ترمذی رحمۃ اللہ علیہ  
الہی بکرمت حضرت خواجہ سید یوسف نور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ



الہی بکرمت حضرت خواجہ سید احمد نور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمت حضرت خواجہ خواجگان شہنشاہ خراسان غوث زمان سید علی غواص  
 ترمذی المعروف پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ

سلسلہ قادریہ

الہی بکرمت سیدنا وشفیعنا و مولانا سرور کائنات نضر موجودات حضرت محمد مصطفیٰ  
 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

- الہی بکرمت سیدنا باب مدینہ علم حضرت علی کرم وحبہ
- الہی بکرمت سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت سیدنا حضرت سید حسن المثنیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت سید عبداللہ الجضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت سید موسیٰ ثانی - - - رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت داؤد امیر محمد اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت سید محمد رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت سید یحییٰ زاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت سید عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت سید ابو صالح موسیٰ چنگی دوست رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر صلیانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- الہی بکرمت حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو فہر رحمۃ اللہ علیہ
- الہی بکرمت حضرت خواجہ عمار یاسر رحمۃ اللہ علیہ
- الہی بکرمت حضرت خواجہ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ
- الہی بکرمت حضرت خواجہ رضی الدین علی - - - رحمۃ اللہ علیہ

الہی بکرمیت حضرت احمد جرجانی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ نور الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ محمود خزرجی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ سید امیر کبیر علی مہدانی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ ابواسحاق ختلانی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ سید محمد نور بخش ترمذی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ سید یوسف نور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت حضرت خواجہ احمد نور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ  
 الہی بکرمیت خواجہ خواجگان غوث زمان اعلیٰ حضرت سید علی خواص ریسریا  
 ترمذی۔ قدسنا اللہ بسره السامی۔

یا الہی از بیات جہاں محفوظ دار ہم بچ این بزرگان قلب را محفوظ دار (آمین)  
 اللہ تعالیٰ ہمیں ان صوفیائے حقانی و علمائے ربانی کی تعلیمات پر عمل کرنے اور ان  
 کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جن کی زندگیاں قرآن و سنت کے سانچے میں  
 ڈھلی ہوئی تھیں۔ دراصل دین اسلام سراسر حبیب حق تعالیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کما یتیق  
 بشانہ الاعلیٰ کی اتباع کا نام ہے۔ اتباع میں کمال، حضورؐ کی محبت میں کمال سے حاصل  
 ہوتا ہے۔ ایمان کی علامت اللہ اور رسولؐ کی محبت ہے۔ قرآن پاک میں مومنوں کی سفت  
 یہ بیان کی گئی ہے (وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ) (مومنوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے  
 ساتھ سب سے زیادہ گہری ہوتی ہے) اس محبت یعنی نختہ ایمان کے حصول کے لئے بھی خود ہی  
 حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا کہ تم  
 اعلانیہ لوگوں سے کہو (وَقُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ) کہ اگر تم

اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو۔ یعنی سچے مومن بنا چاہتے ہو تو میری اتباع و پیروی کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا یعنی اس طرح تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔ نیز یہ بھی فرمایا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ رسول کا اسوہ حسنہ تمہارے لئے یقیناً مشعل راہ ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس میں حضورؐ کی پیروی کے لئے رہنمائی نہ مل سکے۔ عبادات ہوں یا معاملات، معاشیات ہوں یا عمرانیات۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی ہر شعبہ زندگی میں آپ کے فرمودات تولاً و فعلاً ہماری رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔ ذرائع عبادات نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ بھی وہی اللہ کے ہاں مقبول ہیں جو حضورؐ کی اتباع اور آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر کئے جائیں۔ یہی حال واجبات، سنن اور نوافل کا ہے۔ کوئی عبادت جو خلاف طریقہ رسول یعنی خلاف سنت ہو وہ مقبول و محمود نہیں۔ حضور اکرمؐ کی محبت و اطاعت دراصل اللہ کی محبت و اطاعت ہے اور حضور کے اہل بیت و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت و اتباع بھی رسولؐ کی محبت و اتباع کا ثمرہ ہے۔ اسی طرح تابعان رسول علمائے راسخین اولیائے کرام کی محبت بھی اللہ و رسول کے لئے ہی ہے۔ یہ سب محبتیں آپس میں مربوط اور لازم ملزوم ہیں یہی ثمرہ شریعت ہے۔ طریقت و حقیقت اس کے دو خادم بلکہ یہ دونوں شریعت کے دو پیر ہیں جب سالک مومن شریعت پر چل کر طریقت و حقیقت کے پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے تو معرفت الہی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی اعلیٰ حضرت سیر بابا رتدس سرہ العزیز کا نظریہ ہے۔ اپنے صالح بندوں کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ رَالَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہر حال میں یاد کرتے ہیں۔ اسی دوام ذکر و یاد الہی کو حاصل کرنے کے لئے مشائخ طریقت کی صحبت اور ان کے بتائے ہوئے اذکار و وظائف اور مراقبات کی پابندی کی جاتی ہے۔

ذرائع کی پابندی اور محرمات سے بچنا ایک لازمی امر ہے یہ بھی ذکر اور یاد الہی

میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حضور پور شافع یوم تشر سے ہمہ تن یاد الہی کے حصول کے لئے ہر موقع و محل کے مطابق بے شمار دعائیں منقول ہیں جن کا پڑھنا ایک طرف اتباع سنت پر عمل پیرا ہو کر اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف ان کے پڑھنے پر جس ثواب اور اجر کا وعدہ کیا گیا ہے وہ حاصل ہونے کی قوی امید ہے یہی بزرگان کرام کا معمول ہے اور اسی کی تاکید اور تلقین وہ فرماتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک دعائیں جو مختصر بھی ہیں اور جن کا اجر اور ثواب بھی بہت زیادہ ہے جو مومنین کے ساتھ حضور رحمۃ للعالمین کی انتہائی شفقت، رحمت اور رافت کا صلہ ہے۔ عوام کے فائدہ کے لئے درج کی جاتی ہیں تاکہ ان کا وظیفہ باعث خیر و برکت ہو۔

(۱) بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یُضْرَمُ مَعِ اسْمِهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاوٰتِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

دن صبح و شام تین تین بار پڑھنے والا ہر آنت ناگہانی سے محفوظ رہتا ہے۔  
(۲) رَضِیْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا (صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ)

دن - صبح و شام تین تین بار پڑھنے والے کا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ قیامت کے دن اسے راضی و خوش کر دے۔

(۳) اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا سَتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتَ اَبُوْءُكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ

دن - اس کو سیّد الاستغفار کہتے ہیں۔ جو شخص یقین کامل کے ساتھ دن یا رات میں یہ دعا پڑھے۔ اگر اس دن یا رات میں فوت ہو جائے تو یقیناً جنتی ہوگا۔ لہذا

اسے صبح و شام ایک ایک بار پڑھ لینا چاہیے۔

(۴) اَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ تین بار

پڑھ کر سورۃ مشترکی آفری تین آیتیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ

الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

اَمْلِكُ الْقَدُوْسُ اسْتَلَامَ الْمُؤْمِنِ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ

الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ

لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یَسْبِحُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَ هُوَ

الْعَزِيزُ الْحَكِیْمُ (۵) پڑھے۔

دن۔ اگر کوئی شخص صبح پڑھے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے مقرر فرمادیتے ہیں

جو پڑھنے والے کے لئے تمام تکبیریں اور رحمت کی دعا کرتے ہیں اگر وہ اس

دن فوت ہو جائے تو شہید مرے گا۔ اور جو شام کو یہ پڑھے گا۔ یہی درج نصیب

ہوگا۔ لہذا صبح و شام یہ وظیفہ پڑھنے کا معمول بنالینا چاہیے۔

۵۔ صَبِّحْ: اَللّٰهُمَّ مَا اَصْبَحَ بِيْ مِنْ نِّعْمَةٍ اَوْ بِاَحَدٍ مِّنْ خَلْقِكَ

فَمِنْكَ وَحَدِّثْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ فَذَكَ الْحَمْدُ وَ الشُّكْرُ

شام: شام کو اس دعائیں " مَا اَصْبَحَ " کی بجائے " مَا اَمْسَى " پڑھے

افس۔ یہ دعا جو شخص صبح کو پڑھنے تمام دن کی نعمتوں کا شکر ادا ہو جائے گا

اور شام کو پڑھنے سے تمام رات کی نعمتوں کا شکر ادا ہو جائے گا۔

۶۔ سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ

اَسْتَغْفِرُكَ وَ اَتُوْبُ اِلَيْكَ

(ف)۔ کسی مجلس سے اٹھ کر جانے سے پہلے یہ دعا پڑھے۔ اس سے

محاسن میں ناروا گفتگو کرنے یا سننے کی برائی اور گناہ کا کفارہ سوجاتا ہے۔  
 ۷۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ  
 الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ  
 وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(ف) جو شخص یہ کلمات بازار میں پڑھے گا۔ اسے دس لاکھ نیکیاں ملیں گی دس  
 لاکھ گناہ معاف ہوں گے۔ اور دس لاکھ بڑے بلند ہوں گے اور جنت میں اس  
 کے لئے ایک محل تیار ہوگا۔

۸۔ اَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝

(ف) صبح و شام تین تین بار پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ ہر مخلوق خصوصاً زہریلے  
 اور موذی جانوروں کی ایذا اور شر سے بچائے گا،

۹۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ  
 الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُ بِكَ  
 مِنْ غَلَبَةِ الدّٰىنِ وَمِنْ قَهْرِ الرِّجَالِ

(ف) اگر کسی پر قرض ہو یا کسی اور دنیاوی فکر اور پریشانی میں مبتلا ہو تو یہ دعا صبح  
 و شام پڑھے (ماخوذ مشکوٰۃ شریف اور حصن حصین)

(۱۰) سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ ۝  
 وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ ۝ اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ  
 الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۝  
 يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝  
 بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَاتُوبَ إِلَيْهِ ۝

(ف آیت مبارک "لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اسی ملک حقیقی کے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمینوں کی کنجیاں ہیں) کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وہ کنجیاں کیا ہیں تو آپ نے یہ کلمات مبارکہ بیان فرمائے۔ لہذا ان کا صحیح و شام دس دس بار پڑھنا بے شمار دنیاوی و اخروی فوائد کا موجب ہے)

(فرمودہ اعلیٰ حضرت تاضی محمد صدر الدین نقشبندی مجددی)

درود شریف کے فضائل تو ان گنت ہیں اور اہل محبت نے اس کے بے شمار سینے بیان کئے ہیں۔ ذیل میں ایک درود شریف جسے درود ناریہ یا تفریحیہ قرطبیہ کہتے ہیں۔ درج ہے اسے روزانہ گیارہ، اکتالیس یا سو بار پڑھنا بہت سے دنیاوی و اخروی فوائد کے حصول کا ذریعہ ہے

اللّٰهُمَّ صَلِّ صَلٰوةً كَامِلَةً وَسَلِّمْ سَلَامًا تَامًا عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ الَّذِى تَنَحَّلَ بِهٖ الْعُقَدَ وَتَنَفَّرِحُ بِهٖ الْكُرْبَ وَتَقْضِى بِهٖ الْحَوَاجَّ وَتُنَالُ بِهٖ الرِّغَايِبُ وَحَسُنَ الْخَوَاتِمُ وَيَسْتَقِى الْغَمَامَ بِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلَىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ فِي كُلِّ لَمْحَةٍ وَنَفْسٍ لِّعَدَدِ ذٰلِكَ مَعْلُوْمٍ لِّكَ ؕ

(ماخوذ از مجموعہ درود شریف، تاج کمپنی حوالہ ۲۳۹)

# شجرہ نسب کا جائزہ

قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ایک صاحب علم و فضل ادیب، ماہر النسب اور اولیاء کرام و سادات سے گہری محبت رکھنے والے ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت پر بابا کے تفصیلی حالات پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس کہ ان کی ضعیف العمری اور حیاد ثباتِ زمانہ نے ان کو اس کا زخیر کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ صرف ایک مقدمہ اور شجرہ پر تبصرہ لکھ سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کی امداد فرمائے تاکہ ان کی معلومات کا ذخیرہ نصیب شہرہ آجائے۔ اعلیٰ حضرت پر بابا علیہ الرحمۃ کے شجرہ نسب پر جو تحقیقی معلومات جناب قاضی صاحب موصوف زاد اللہ شرفہ نے فراہم کی ہیں ان کا مطالعہ قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لہذا ان کی بحث نقل کی جاتی ہے۔

”حضرت شیخ الاسلام والمسلمین سید السادات علی ترمذی المعروف پر بابا علیہ الرحمۃ کا شجرہ نسب آپ کے نامور خلیفہ مولانا عبدالرشید الملقب بہ اخوند زبیر نے اپنی تالیف تذکرۃ الابراہیم شرار (صفحہ ۱۳۵ مطبوعہ پشاور) میں اس ترتیب سے درج کیا ہے۔ سید علی ابن سید قنبر علی ابن سید احمد نور ابن سید یوسف نور ابن سید محمد نور بخش ترمذی ابن سید احمد بنغیم ابن سید براق ابن سید احمد شتاق ابن سید شاہ ابوتراب ابن سید حامد ابن سید محمود ابن سید اسحاق ابن سید عثمان ابن سید جعفر ابن سید عمر ابن سید محمد ابن سید حسام ابن سید شاہ ناصر خسرو ابن



سید جلال گنج علم ابن سید امیر علی ابن سید عبدالرحیم ابن سید محمود کی ابن سید محمد ہدی ابن حضرت  
امام حسن عسکری ابن حضرت امام علی نقی ابن حضرت امام محمد تقی ابن حضرت امام علی رضا ابن حضرت  
امام موسیٰ کاظم ابن حضرت امام جعفر صادق ابن حضرت امام محمد باقر ابن حضرت امام علی  
زین العابدین ابن حضرت امام حسین سید الشہداء رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

سطور بالا میں جو شجرہ نسب درج کیا گیا ہے یہی اعلیٰ حضرت پر بابا کی نسل کے  
اکثر سادات کے شجروں میں موجود ہے اور بعد کے آنے والے سوانح نگاروں نے بھی اسے  
لفظ بہ لفظ اسی طرح نقل کیا ہے۔ یہاں تک کہ نو دراقم المحرف (عبدالعلیم اثر افغانی) نے  
بھی اپنی تالیف ”روحانی رابطہ“ میں یہی شجرہ مندرجہ بالا ترتیب و تفصیل سے درج  
کیا ہے۔ لیکن اس شجرہ کے بعض نام جس طرح درج کئے گئے ہیں ان میں چند ایک اشکالات  
والتباسات موجود ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا اور ان کی وضاحت ضروری ہے۔

ار پہلی بات یہ کہ آپ کے اجداد میں تین نام اس طرح لکھے گئے ہیں (سید احمد نور  
ابن سید یوسف نور ابن سید محمد نور بخش ترمذی) حالانکہ اس میں آخری نام صحیح طور پر یوں  
لکھنا چاہیے تھا (سید محمد نور، نور بخش یا محمد نور الملقب بہ نور بخش) اس کی وجہ یہ ہے  
کہ اس جلیل القدر نیند نے سرزمین ایران میں تصوف کے ایک نئے سلسلے کو فروغ دیا تھا  
جس کو سلسلہ نور بخشیہ کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ ”سید محمد نور بخش ترمذی  
سلسلہ کبرویہ کے جلیل القدر بزرگوں میں سے تھے اور بعد میں سلسلہ نور بخشیہ کے بانی بھی  
تھے۔ آپ کے اس سلسلہ نور بخشیہ کو خراسان و ایران میں بڑی مقبولیت حاصل رہی تھی اور  
اس مبارک تصوفی مسلک کے آثار اب بھی سرزمین ایران میں موجود ہیں“ چنانچہ اس پس منظر  
کی رو سے آپ کا پورا نام یوں لکھنا چاہیے: ”سید محمد نور۔ نور بخش“

۱۔ متعدد کتب اور سلسلہ ہائے طریقت میں آپ کا اسم گرامی سید نور بخش ترمذی ہی درج ہے  
البتہ سلسلہ نور بخشیہ کے بانی ضرور کہلاتے ہیں۔

۲، دوسری بات یہ ہے کہ لاد خود راقم الحروف کی تالیف روحانی رابطہ (صفحہ ۷۳۳) (۷۳۳)

۱) ایک ہم عصر مؤلف اعجاز الحق قدوسی کی تالیف تذکرہ صوفیائے سرحد (صفحہ ۵۶)

۲) حضرت مولانا شیخ اخوند درویشہ کی تالیف تذکرہ الابراہیم والاشرار (صفحہ ۱۳۵)

۳) جناب مولانا علامہ سید محمد امین گیلانی خوگیاہی (افغانستان) کی تالیف "مقدمہ بہ تاریخ الانغان (مؤلفہ سید جمال الدین افغانی طبع کابل صفحہ ۶) میں حضرت سید علی ترمذی (پیر بابا) کے جد امجد سید احمد بنغیم کے والد ماجد کا نام سید براق درج کیا گیا ہے ہم کہتے ہیں یہ نام جس طرح حرف (س) سے ضبط کیا گیا ہے یہ درست نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح تلفظ حرف (د) سے سید براق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت ترمذی سادات کے تین تلمیذ شجرے میرے پیش نظر ہیں (۱) قبائلی علاقہ باجوڑ کے سید محبوب جان ترمذی کے شجرے (۲) دادی پشاور موضع محب بانڈہ کے سید عبدالخالق ترمذی مرحوم کے شجرے اور (۳) شجرہ مندرجہ کتاب اسرار طریقت مؤلفہ سید شاہ محمد غوث گیلانی لاہوری۔ ان تینوں شجروں میں یہ نام صحیح طور پر شاہ براق درج کیا گیا ہے۔ علاقائی لہجوں کے اختلاف کے پیش نظر اس حرف (د) کی جگہ حرف (ل) تلفظ کرنے سے یہ (بلاق) بھی بولا جاتا ہے اور یہاں سکونت پذیر ہونے کی نسبت سے خواجہ سید بہاؤ الدین نقشبند کے جد امجد سید داؤد رومی کو بھی شاہ بلاق کہا گیا ہے (داؤد رومی شاہ بلاق ابن سید کمال الدین نقیب ابن سید جمال الدین امیر تفضی ابن سید محی الدین نجیب ابن سید امیر علی (حبیب) ابن سید فخر الدین عبدالرحیم ابن سید خیر الدین محمود ابن سید ابو عبداللہ علی اکبر ابن حضرت امام حسن عسکری رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسی طرح حضرت پیر بابا کے جد امجد سید احمد بنغیم کے والد ماجد بھی شاہ براق کے نام سے یاد کئے گئے ہیں۔ حضرت شاہ محمد غوث قادری کی تالیف اسرار طریقت میں یہ نام شاہ ہمدان لکھا ہے۔ یعنی براق کی جگہ ہمدان تحریر کیا گیا ہے لیکن جانتا ہوں کہ پیر بابا صاحب کے شجرہ نسب کا شاہ ہمدان اور سید امیر کبیر علی ہمدانی دو الگ الگ شخصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

جبکہ دونوں کا زمانہ ایک ہے اور اوپر جا کر سید حسین الاصفہانی بن علی زین العابدین پر ان دونوں کا شجرہ مل جاتا ہے۔ مزید تفصیل آگے چل کر آتی ہے۔

پہلی بات جو مذکورہ شجرہ میں سب سے زیادہ قابل غور ملاحظہ ہے وہ یہ نام ہیں۔  
 سید محمود مکی ابن سید محمد مہدی ابن امام حسن عسکریؑ ہم کہتے ہیں کہ حضرت امام حسن عسکریؑ کے فرزند سید امام مہدی کے کسی فرزند ہونے یا ان کی نسل باقی رہنے کا سوال ہی خارج از بحث ہے جبہ یہ کہ امام عالی مقام محمد مہدیؑ تو کتاب رحمتہ للعالمین (جلد ۲ صفحہ ۱۵۴) تالیف قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی روایت کے مطابق چار سال کی عمر میں مملکت عراق کے شہر (سامرا - سرمن رای) کی ایک پہاڑی غار میں غائب ہو گئے تھے اور سید امیر علی کی تالیف "سپرٹ آف اسلام" میں بیان کیا گیا ہے کہ سید محمد مہدی (ولادت نصف شعبان ۲۵۵ھ بمطابق یکم اگست ۸۶۹ء) پانچ سال کی عمر میں (۲۶۷ھ / ۸۷۴ء) سامرا کی پہاڑیوں میں غائب ہو گئے تھے۔ واقعات کا تسلسل یہ بتلا رہا ہے کہ مورخہ ۸ ربيع الاول ۲۶۷ھ بمطابق ۲ جنوری ۸۷۴ء کو حضرت امام حسن عسکری کی وفات ہوئی اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد امام محمد مہدیؑ غائب ہو گئے تھے اور اسی مناسبت سے اہل تشیع آپ کے نام کے ساتھ حاضر امام اور غائب امام کے توصیفی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جب چار پانچ سال کی عمر میں آپ کا غائب ہونا تسلیم شدہ امر ہے تو ایسی صورت میں آپ کی نسل باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہے کہ حضرت امام حسن عسکریؑ کی نسل باقی ہے اور یہ کہ محمود مکی آپ کا پوتا بھی ہے لیکن زیر بحث یہ بات رہی ہے کہ سید محمود مکی کو سید محمد مہدی کا فرزند کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس سوال پر جب مزید تحقیق کی گئی تو معلوم ہو گیا کہ واقعات کی صورت یہ ہے کہ حضرت ابو محمد امام حسن عسکریؑ نے ۲۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کے تین بیٹے باقی رہ گئے تھے (۱) قاسم (۲) علی اکبر (۳) محمد مہدی۔ پہلا فرزند تو لاوارث تھا

تیسرے راہ امام محمد مہدی (چار سال کی عمر میں غائب ریافت ہو گئے تھے۔ اور آپ کی نسل دوسرے فرزند سید علی اکبر سے باقی ہے اور یہ محمود مکی دراصل ان ہی ابو عبداللہ علی اکبر کے فرزند ہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے (۱) عبداللہ (۲) عبدالرحیم۔

### سید عبداللہ ان کے دو فرزند تھے (۱) احمد (۲) حسین

راہ سید احمد بن سید عبداللہ بن محمود مکی وہ بزرگ ہیں جو غزنوی سادات کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کی نسل کے سادات پشین (کوٹہ بلوچستان) مستونگ، قندھار، مشکی، غزنی اور پشاور میں آباد ہیں اور اہل سنت و الجماعت کے پیروکار ہیں۔ اسی خاندان میں حضرت سید ہارون و سید علی دونوں بھائی غزنی کے متصل شمش کاؤپشاور تشریف لاکر حضرت پیر بابا کے حلقہ مریدین میں شامل ہو گئے تھے۔ آگے چل کر آپ کا مزید تذکرہ درج کیا جاتا ہے۔

راہ سید حسین بن سید عبداللہ و سید محمود مکی بزرگ ہیں جن کی چھٹی پشت میں ایک نواسے کا نام سید خواجہ مودود حشتی ہراتی (متوفی ۵۲۷ھ / ۱۱۳۲ء) ہے جن کی نسل مودودی سادات اور ہردی سادات کے ناموں سے یاد کی جاتی ہے۔ آپ کا شجرہ اس طرح ہے

سید مودود حشتی بن محمد سمعان بن ابراہیم بن محمد بن حسین بن عبداللہ بن محمود مکی بن ابو عبداللہ علی اکبر بن حضرت امام حسن عسکریؑ

### سید عبدالرحیم ان کے فرزند کا نام سید امیر علی تھا جن کے ایک فرزند کا نام

سید محی الدین تھا اور ان تک حضرت محبوب ربانی سید بہاؤ الدین نقشبند بخاریؒ "بانی" سلسلہ نقشبندیہ کا شجرہ نسب پہنچتا ہے۔

شجرہ نسب پیر بابا کے متعلق دوسری روایت بحوالہ اسرار طریقت مولفہ سید شاہ

محمد غوث لاہوری میں نام اس طرح ہے سید محمد غوث گیلانی ابن بنت سید جمال الدین ابن سید عبدالوہاب المعروف میاں عبدال بابا ابن سید مصطفیٰ ابن سید سادات علی

ترمذی المعروف پیر بابا ابن سید قنبر علی ابن سید احمد نور ابن سید یوسف نور ابن سید  
محمد نور بخش ابن سید احمد بیغم ابن سید شاہ ہمدان ابن سید احمد شتاق ابن سید شاہ ابوتراب  
ابن سید حامد ابن سید محمد ابن سید حسام الدین ابن سید شاہ ناصر خسرو ابن سید جلال گنج علم  
ابن سید امیر علی ثالث ابن ابوالحسن علی ابن سید عبداللہ ثانی ابن سید ابوالحسن علی صالح  
ابن سید عبداللہ زح ابن سید حسین اصغر ابن سید السادات علی زین العابدین ابن  
سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

بحوالہ اسرار طریقت صفحہ ۵۵ مطبوعہ لاہور اور قلمی نسخہ در ملکیت جناب سید امیر شاہ

قادری گیلانی زاد شرف ساکن یکہ توت لشارم

ایک نظر شجرہ مؤخر الذکر سے ظاہر ہے کہ اس میں حضرت پیر بابا صاحب کا

شجرہ سید حسین اصغر بن حضرت امام علی زین العابدین تک پہنچا گیا ہے۔ جبکہ اخوند ریزہ  
کی روایت میں آپ کا شجرہ حضرت امام محمد باقر بن حضرت امام علی زین العابدین تک  
پہنچا گیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سید امیر علی تک نام دونوں شجروں میں ایک جیسے ہیں  
بتدلی اس سے اوپر کے ناموں میں کی گئی ہے۔ اخوند ریزہ کے شجرہ میں سید امیر علی  
کے والد کا نام عبدالرحیم ہے اور شاہ محمد غوث صاحب کے شجرہ میں ابوالحسن علی ہے اب  
ہم اگر یہ مان لیں کہ حضرت پیر بابا کا شجرہ نسب وہی ہے جو شاہ محمد غوث صاحب  
نے درج کیا ہے تب ایسی صورت میں بھی اس شجرہ میں کچھ اشکالات والتباسات ہیں۔  
اور بعض ایسی باتیں ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

از سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ محمد غوث کا شجرہ اپنی موجودہ شکل میں ناقص  
ہے۔ اس میں حضرت پیر بابا کا نام بائیسویں پشت میں آجاتا ہے جبکہ علم اصول تاریخ کی رو  
سے ایک سو سال میں تین آدمی آجاتے ہیں۔ اس کے حساب سے پیر بابا صاحب کا زمانہ تقریباً  
۷۳۳ھ بن جاتا ہے جبکہ آپ ۹۹۱ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ

کے شجرہ میں آٹھ نام کم ہیں آپ کا نام شجرہ میں تیسویں نمبر پر آنا چاہیے تھا۔ حضرت  
 اخوندروزیہ کے شجرہ پر نظر ڈالئے اس میں جو نام موجود ہیں وہ جناب شاہ محمد غوث  
 صاحب نے نہیں لکھے۔ ان کے شجرہ میں ۳۱ حامد ابن محمد ابن حسام الدین ہے جبکہ اخوندروزیہ  
 کے شجرہ میں یہ نام اس ترتیب سے ہیں۔ حامد ابن محمود ابن اسحاق ابن عثمان ابن جعفر  
 ابن عمر ابن محمد ابن احسام الدین اس طرح حامد اور محمد کے درمیان پانچ نام وہ ہیں جو شاہ  
 محمد غوث کے شجرہ میں لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ لیکن اس طرح بھی ناموں کی تعداد ستائیس  
 بنتی ہے۔ اب بھی تین نام کم ہیں۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ یہ کئی کہاں پر اور شجرہ کے کن  
 ناموں کے درمیان ہے۔

۱۲ شاہ محمد غوث صاحب کے شجرہ میں ایک دوسری بات جو قابل غور ہے اور اس کی  
 تصحیح ضروری ہے وہ یہ کہ آپ فرماتے ہیں "علی صالح بن عبداللہ اعرج" اب اتعات  
 یہ ہیں کہ حسین الاصغر کے پانچ فرزند ہیں۔ عبداللہ زاہد، عبید اللہ اعرج، علی، سلیمان  
 ابو محمد الحسن۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو اعرج کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں وہ عبداللہ اعرج  
 نہیں بلکہ عبید اللہ اعرج ہیں اور سید ابو الحسن علی صالح ان کے فرزند ہیں نہ کہ عبداللہ  
 کے کیونکہ وہ اعرج نہیں بلکہ زاہد کے عرفی نام سے مشہور ہیں۔ ملا حسین واعظ کاشفی ہردی  
 اپنی تالیف روضۃ الشہداء میں لکھتے ہیں کہ ابو الحسن علی صالح ایک بزرگ ہستی تھے۔ عراق  
 کی حکومت و ریاست آپ کی اولاد کے ہاتھ میں تھی۔ آپ کی کنیت ابو الحسن ہے۔ آپ  
 مستجاب الدعوات تھے اور آپ کی نسل عبید اللہ ثانی سے جاری ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ یہ نام  
 بھی شاہ محمد غوث صاحب عبداللہ ثانی لکھ رہے ہیں۔

نیز حضرت شاہ محمد غوث صاحب فرماتے ہیں: "چونکہ حضرت سید عباس راہن  
 سید جمال الدین ابن سید عبدالوہاب ابن سید مصطفیٰ ابن پیر بابا، فقیر کے مامور تھے  
 جو سید علی ترمذی پیر بابا اور سید علی ہمدانی قدس اللہ اسرارہم کی اولاد میں سے

صحیح النسب سید تھے اور پورے متقی و پرہیزگار تھے، گویا شاہ محمد غوث صاحب نے مندرجہ بالا سطور میں سید علی ترمذی کو سید امیر کبیر علی ہمدانی کی نسل سے بیان کیا ہے جو ایک جلیل القدر اور مشہور بزرگ ہو گئے ہیں۔ سرزمین کشمیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں آپ کا نام زندہ جاوید ہے، آپ کے سلسلہ نسب کے متعدد شجرے ہمارے پاس موجود ہیں، اگر بقول شاہ محمد غوث صاحب "پیر بابا صاحب" کا شجرہ نسب سید امیر کبیر علی ہمدانی تک پہنچتا ہے تو ہمیں ان کے مختلف شجروں پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی تاکہ جہاں جہاں ناموں میں فرق ہو، ان کی وضاحت کی جاسکے۔ اس سلسلہ میں سید علی ہمدانی کے خاندان سے تعلق رکھنے والے دوسرے خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب کا ایک تقابلی مطالعہ کرنا ہوگا۔

(۱) حضرت شاہ محمد غوث صاحب نے سید علی رپیہ بابا، ابن سید قمبر علی ابن سید احمد نورا بن سید یوسف نورا بن سید محمد نور بخش ابن سید احمد بیغم ابن شاہ ہمدان لکھا ہے۔

(۲) اخوند ریزہ بابا نے سید احمد بیغم ابن سید براق لکھا ہے، یعنی شاہ ہمدان کی بجائے شاہ براق لکھا ہے۔

(۳) اس کے بعد شاہ محمد غوث صاحب نے عبید اللہ ثانی کے فرزند کا نام ابو الحسن علی لکھا ہے، جبکہ روضۃ الشہداء میں یہ نام صرف علی ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ابو الحسن تو آپ کے جہاں مجاہد ہیں، جن کی علی صالح کنیت ہے۔

(۴) اس کے بعد شاہ محمد غوث صاحب نے اس علی را ابو الحسن کے فرزند کا نام امیر علی ثالث لکھا ہے، حالانکہ روضۃ الشہداء میں یہ نام عبید اللہ ثالث ہے۔

(۵) اسی طرح شاہ محمد غوث صاحب نے امیر علی ثالث رجو صحیح نام عبید اللہ ثالث کے فرزند کا نام سید جلال گنج لکھا ہے۔

حالانکہ صحیح شجرہ اس طرح ہے یا ہونا چاہیے۔ سید جلال الدین جعفر گنج عالم ابن سید امیر علی ابن ابو علی محمد امیر حاج ابن امیر ابو الحسن علی صالح ابن ابو علی عبد اللہ اعرج ابن سید حسین الاصغر ابن سید امام علی زین العابدین سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یعنی شاہ محمد غوث صاحب کے شجرہ کی رو سے سید جلال الدین جعفر گنج عالم جو نویں پشت میں آرہے ہیں۔ روضتہ الشہداء کے اس شجرہ کی رو سے بارہویں پشت میں آجاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے جو تین ناموں کی کمی بتائی گئی تھی اس حساب سے وہ کمی پوری ہو جائے گی اور حضرت پیر بابا کا نام اس شجرہ کی رو سے تیسویں پشت میں آجائے گا۔

**نوٹ** مندرجہ بالا امیر ابو الحسن محمد اشتر کے متعلق روضتہ الشہداء کا بیان ہے کہ آپ کے بیس فرزند تھے اور یہ کہ آپ مشہور شاعر ابی الطیب کے ممدوح تھے۔ دوسری بات یہ کہ سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے والد سید امیر علی کے ایک بھائی کا نام سید ابو علی مسلم احوال امیر حاج المعروف کلبش عبد اللہ تھے اور ان کے فرزند عمر مختار امیر حاج، سادات بنی مختار آپ کی نسل سے ہیں۔ اسی خاندان کے سادات علانہ نیزہ اور کرنی میں موجود ہیں۔ تیسری بات یہ کہ امیر ابو الحسن محمد اشتر کی نسل اشتری سادات کہلاتی ہے جن میں ابو علی نقیب واسط ابو المعالی اور ابو الفضائل، بنو عرام، بنو عجیبہ، بنو صائم، بنو معلق، بنو ابی الغنم، بنو اصمید، بنو طبعی، نقبائے عراق اور اسرہ سے حاج کے خاندان قابل ذکر ہیں۔

شاہ محمد غوث صاحب کی تیسری بات جو قابل غور ہے وہ فرماتے ہیں ”چونکہ سید عباس فقیر کے ماموں تھے جو حضرت سید علی ترمذی پیر بابا اور سید علی ہمدانی قدس سرہم کی اولاد میں صحیح النسب سید تھے اور پورے متقی و پیرہنیر گارتھے“ شاہ محمد غوث صاحب نے شجرہ میں تو اجمالاً شاہ ہمدان لکھا ہے اور یہاں تصریح کر دی کہ شاہ ہمدان سے مراد سید علی ہمدانی ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جو ہماری الجھنوں میں اضافہ کر دیتی ہے اور ہمیں



اس پر بحث و نظر کی ضرورت ہے۔

(الف) ایک تو وہ شجرہ ہے جو شاہ محمد غوث صاحبؒ کی روایت کے مطابق سید علی

ترمذی رپیر بابا سے تعلق رکھتا ہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

(ب) دوسرا شجرہ کرم ایجنسی کے سادات کڑمان اور شلوزان کا ہے جس میں ان کے

جد امجد سید ابوالحسن فخر عالم کا سلسلہ حضرت سید حسین الاصغر تک پہنچا گیا ہے جو اس

طرح ہے: سید ابوالحسن محمد ولد سید ابوالقاسم جعفر ولد سید قاسم الملقب بہ یحییٰ (مزار

درہرات) ولد سید حسن (مدفن درنجش) ولد سید جعفر ولد سید حسین ولد سید جعفر عبد اللہ

اعرج (مدفن کوفہ) ولد سید حسین اصغر ولد سید امام علی زین العابدین ولد سید الشہداء

حضرت امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

(ج) تیسرا شجرہ حضرت سید امیر کبیر علی ہمدانیؒ کی روایت خزنیتہ الاصفیاء اس طرح ہے

امیر کبیر سید علی ہمدانی ابن شہاب الدین ابن محمد ابن علی ابن یوسف ابن شاہ شریف ابن

سب اللہ محمد ثانی ابن جعفر ابن عبد اللہ ابن حسن ابن حسین ابن عبد اللہ زاہد ابن حسین

اصغر ابن امام علی زین العابدین ابن سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم صل

صل سید امیر کبیر علی ہمدانی کے والد کا نام سید شہاب الدین ہے جبکہ بمطابق شجرہ رپیر بابا

(در تذکرۃ الابرار والابرار) سید احمد شاہ بداق کے والد کا نام سید احمد شتاق ہے۔ سید علی

ہمدانی (بمطابق کتاب حضرت امیر علی ہمدانی مؤلفہ ڈاکٹر محمد ریاض صفحہ ۴۴ - ۴۶)

شاہ ہمدانی کی ایک بیٹی تھی جو جناب ابواسحاق ختلانی کے عقد میں تھی جو شاہ ہمدان کے

(داماد) اور حلیفہ مبارک و جانشین تھے۔ آپ کے اکلوتے بیٹے کا نام سید امیر محمد ہمدانی تھا۔

جبکہ روایت اخوندرویزہ کے مطابق شاہ بداق کے فرزند کا نام سید احمد سعیم ہے۔ لہذا

سید امیر کبیر علی ہمدانی کے ساتھ حضرت رپیر بابا کا نسب تعلق نہیں ثابت ہوتا البتہ آپ کے

جد امجد سید محمد نورنجش کو طریقہ کبریہ میں سید علی ہمدانی سے نسبت ہے۔ سید محمد نورنجش

(۵) چوتھا شجرہ سید امیر کبیر علی ہمدانی کی والدہ ماجدہ کا ہے جو سید علی ہمدانی  
 ابن بنت (نامعلوم) ابن سیدہ زہرا بنت سید قاسم ابن جمال الدین محمد ابن حسن ابن ابی  
 زید ابن علی کبا کی ابن عبداللہ ابن علی ابن ابراہیم ابن اسماعیل المنقذی ابن جعفر ابن  
 عبداللہ (زاہد) ابن حسین اصغر ابن امام علی زین العابدین ابن امام حسین علیہ السلام۔  
اہم نکتے۔ جب ہم ان چاروں شجروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں چند نکات ایسے  
 سامنے آتے ہیں جو بحث طلب ہیں۔

نکتہ اول۔ ان شجروں میں اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت سید حسین الاصفغر کے  
 نام دو طرح ضبط کئے گئے ہیں۔ اسرار طریقت میں لکھا ہے۔ عبداللہ اعرج ابن سید  
 حسین اصغر، دوسری طرف خزنیۃ الاصفیاء میں ہے۔ سید ابو جعفر عبداللہ اعرج ابن سید  
 حسین اصغر، تیسری خزنیۃ الاصفیاء اور فصول الغریبہ میں علی الترتیب عبداللہ زاہد  
 اور عبداللہ بن حسین اصغر لکھا ہے۔ اسرار طریقت کے مطابق سید علی ہمدانی کا سلسلہ نسب  
 عبداللہ اعرج اور خزنیۃ الاصفیاء کی روایت سے سید علی ہمدانی کا سلسلہ نسب عبداللہ زاہد  
 تک پہنچتا ہے۔ یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سید علی ہمدانی کے جدا جدا اور سید  
 حسین اصغر کے فرزند کا نام سید عبداللہ ہے یا سید عبید اللہ؟ خزنیۃ الاصفیاء کا عبداللہ  
 زاہد اور اسرار طریقت کا عبداللہ اعراج ظاہر ہے دو الگ الگ نام ہیں اور حقیقت بھی  
 یہی ہے ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ التباس کی وجہ کیا ہے جس کے لئے ہمیں سید حسین الاصفغر  
 کے فرزندوں کے شجروں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

نکتہ دوم۔ دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ کتاب اسرار طریقت، خزنیۃ الاصفیاء اور  
 شجرہ سادات کرمان کے مندرجہ ناموں میں بھی کمی بیشی ہے اور ناموں کی ترتیب میں بھی

خلیفہ مجاز تھے۔ حضرت سید ابواسحاق خلدانی کے جو جانشین تھے امیر کبیر علی ہمدانی کے سید  
 محمد نور بخش نے بعد میں سلسلہ نور بخشیہ کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔

فرق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ شجرے نقل کئے ہیں ہر ایک سے درمیان میں جگہ جگہ سے کچھ نام چھوڑ دیئے ہیں یا ان کی ترتیب میں تبدیلی پیدا کی ہے یا بعض نام صحیح طور پر نہیں لکھے گئے ہیں اور بعض شجروں میں ناموں کی بجائے صرف اسمائے کنیت درج کئے گئے ہیں۔ مختلف شجروں کے تقابلی مطالعہ سے اس قسم کے فرق اور کمی بیشی پر روشنی پڑ سکتی ہے اور ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ حالت میں ہر شجرہ میں پورے نام درج نہیں ہیں اور اس طرح یہ تینوں شجرے اپنی اپنی جگہ غیر مکمل اور ناقص ہیں لہذا ہم چاہتے ہیں کہ تقابلی مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ تینوں شجرے مکمل ہو جائیں اور ان کی تصحیح کی جاسکے۔

حسین الاصغر اور ان کے فرزند ان - کتاب رحمۃ اللعالمین مؤلفہ قاضی محمد سلیمان

سلمان منصور پوری میں حضرت حسین الاصغر ابن حضرت امام علی زین العابدین کے فرزند کے نام یہ ہیں راہ عبداللہ زاہد (۴) عبید اللہ اعرج (۳) علی (۲) ابو محمد الحسن (۵) سلیمان ان سب کی نسل باقی ہے، حجاز، شام، عراق اور مغرب راہ بجزائر، مراکش، تیونس میں ان کی اولاد پائی جاتی ہے۔ بلکہ ہم کہتے ہیں اس نسل کے سادات ایران، خراسان، طہارستان، برصغیر پاک و ہند اور افغانستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس بیان سے واضح ہے کہ سید حسین اصغر کے فرزندوں میں بڑے کا نام عبداللہ اور زاہد اس کا توصیفی لقب ہے۔ اسی طرح اعرج کا توصیفی لقب سے خصوصیت کے ساتھ آپ کے دوسرے فرزند عبید اللہ یاد کئے جاتے ہیں۔ اس وضاحت کے پیش نظر جہاں اسرار طریقت میں اور شجرہ سادات کٹرمان میں اعرج کے لقب سے عبداللہ کو یاد کیا گیا ہے اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس نام کا توصیفی لقب ٹھیک ہے تب یہ نام عبداللہ نہیں بلکہ عبید اللہ پڑھنا چاہیے اور اگر یہ صحیح نام عبداللہ ہے تو اس کے ساتھ اعرج نہیں بلکہ زاہد پڑھنا چاہیے۔ جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء کی

روایت میں درج ہے اس وضاحت کی رو سے سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے جدِ امجد سید حسین الاصفغر کے سب سے بڑے فرزند عبداللہ زاہد کو سمجھنا چاہیے وجہ یہ ہے کہ ان دونوں شجروں میں حسین الاصفغر کے ایک دوسرے پوتے کا نام عبداللہ اور عبداللہ ثانی درج ہے نہ کہ عبید اللہ ثانی۔ اس سے یہ مراد لیا جائے گا کہ اس شجرہ کے سادات عبید اللہ اعرج کی نسل سے نہیں بلکہ عبداللہ زاہد کی نسل سے ہیں اور اس طرح اسرارِ طریقت وغیرہ میں تصحیح کر کے عبید اللہ اعرج کی بجائے عبداللہ زاہد لکھا جائے گا۔

نکتہ سوم تیسرا قابل غور نکتہ عبداللہ زاہد کے فرزند کے نام میں اختلاف کا ہے۔ خزنیۃ الاصفیاء میں ہے۔ حسن ابن حسین ابن جعفر ابن حجر ابن عبداللہ زاہد اور شجرہ سادات کثرمان میں ہے۔ حسن ابن جعفر ابن حسین ابن ابو جعفر عبداللہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خزنیۃ الاصفیاء کے شجرہ ایک نام حجر کا اضافہ التباس پر مبنی ہے واقعات یہ ہیں کہ جعفر بن عبداللہ زاہد مدنیہ منورہ کے قریب مقام حجر میں سکونت پذیر تھے اور جعفر حجری کے نام سے یاد کئے جاتے تھے بعد میں حجر کے مقام کو غلطی سے والد کا نام سمجھا گیا یہ نام حجر قرآن پاک میں بھی مذکور ہے۔ "و کذب الضحباب الحجر المرسلین" اس وضاحت کے پیش نظر عبداللہ زاہد کے فرزند کا نام جعفر قرار پاتا ہے اور اس بنا پر شجرہ سادات کثرمان میں عبداللہ زاہد کا اسم کنیت ابو جعفر ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری بات اس شجرہ میں ناموں کی ترتیب ہے یہ نام حسین ابن جعفر ابن حسین ابن عبداللہ زاہد کی بجائے اس ترتیب سے ہونے چاہئیں۔ حسن ابن حسین ابن جعفر ابن عبداللہ زاہد۔ کتاب فصول الفخریہ میں بھی عبداللہ کے فرزند کا نام جعفر ہے اور درمیان میں حجر کا اضافہ صحیح نہیں ہے۔

نکتہ چہارم۔ سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ عبداللہ زاہد کے فرزندوں میں ایک پوتے کا نام عبید اللہ ثانی ہے اس رعبید اللہ ثانی اور عبداللہ زاہد راول کے

درمیان مختلف شجروں میں جو نام دیئے گئے ہیں۔ ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔  
 (۱) کتاب اسرار طریقت کے شجرہ میں ایک ہی نام علی صالح و زح ہے (عبداللہ  
 ثانی ابن علی الصالح ابن عبداللہ زاہد (اول)  
 (ب) شجرہ سادات کثرمان میں سید عبداللہ ثانی اور عبید اللہ اعرج کے ناموں  
 کے درمیان چار نام ہیں۔ عبداللہ ثانی ابن قاسم ابن حسن ابن جعفر ابن حسین ابن  
 عبید اللہ اعرج۔

(ج) خزنیۃ الاصفیاء میں یہ نام اس طرح ہیں۔ عبداللہ ثانی ابن محمد ابن  
 حسن ابن حسین ابن جعفر ابن حجر ابن عبداللہ زاہد۔

ان تینوں شجروں کے ناموں میں اس طرح تطبیق کی جاسکتی ہے کہ:۔  
 (۱) شجرہ اسرار طریقت کی روایت درست تسلیم کی جائے کہ عبداللہ ثانی کے  
 والد کا نام علی الصالح ہوگا لیکن علی الصالح براہ راست عبداللہ زاہد کا فرزند  
 نہیں بلکہ ان دونوں ناموں کے درمیان شجرہ سادات کثرمان کے ناموں کا اضافہ  
 کرنا ہوگا۔ اس طرح سے عبید اللہ ثانی ابن علی الصالح ابن قاسم علقب بہ بھیلی ابن  
 حسن ابن حسین ابن جعفر ابن عبداللہ زاہد ہوگا۔

۲) باقی رہ جاتی ہے یہ بات کہ سادات کثرمان کے مندرجہ بالا شجرہ میں حسن  
 بن حسین کے فرزند کا نام لکھا گیا ہے ابو القاسم الملقب بہ بھیلی اور خزنیۃ الاصفیاء  
 میں محمد لکھا گیا ہے۔ اس میں تطبیق پیدا کرنے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک  
 یہ کہ اس نام کو اس طرح لکھا جائے۔ ابو القاسم محمد (بھیلی) دوسری صورت یہ ہے  
 کہ ان ہر دو ناموں کو ابو القاسم بھیلی پڑھا جائے اور درمیان میں ایک نام محمد کا اضافہ  
 کیا جائے اس طرح، عبید اللہ ثانی ابن ابو القاسم بھیلی ابن محمد ابن حسن ابن حسین  
 ابن جعفر ابن عبداللہ زاہد ابن حضرت امام علی رضی اللہ عنہما ہوگا۔

حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین . وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَةِ الْحَالِ .

نکتہ پنجم - سادات کٹرمان اور خزنیۃ الاصفیاء دونوں کے شجرز میں عبداللہ ثانی کے فرزند کا نام جعفر ہے لیکن اسرار طریقت میں عبداللہ ثانی اور جلال الدین جعفر گنج عالم شہید کے درمیان دو ناموں کا اضافہ اس طرح موجود ہے سید جلال الدین جعفر گنج عالم ابن سید امیر علی ثالث ابن سید ابو الحسن علی ابن سید عبداللہ ثانی . ہم کہتے ہیں کہ کتاب اسرار طریقت کا یہ بیان کہ سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے والد ماجد کا نام سید امیر علی ثالث اس لئے صحیح ہے کہ مولانا شیخ غوث الخلائق اخوندزادہ کی تالیف تذکرہ الابرار والاشرار میں بھی سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے والد کا نام سید امیر علی درج ہے . البتہ اسرار طریقت میں ان کے ساتھ لفظ 'ثالث' کی جو تصریح موجود ہے وہ اس لحاظ سے درست ہے کہ جب ہم اس شجرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سید عبداللہ زاہد کی نسل میں سید جعفر کے والد سید امیر علی ابن ابوالحسن علی ابن عبداللہ ثانی علی الصالح) واقعی تیسرے نمبر کے علی ہیں .

نکتہ ششم - اخوندزادہ بابا اور سید شاہ محمد غوث صاحب دونوں میں سید جلال الدین جعفر گنج عالم ابن سید امیر علی کا لقبی نام گنج علم درج ہے اور انہی کے فرزند کا نام سید شاہ ناصر خسرو ہے . خزنیۃ الاصفیاء و سادات کٹرمان کے شجرہ میں سید امیر علی کے فرزند کا نام علی الترتیب جعفر اور ابوالقاسم جعفر درج ہے اور شجرہ سادات کٹرمان میں انہی سید ابوالقاسم جعفر کے فرزند کا نام ابوالحسن فخر عالم ہے جن کا پورا نام اس طرح ہے "ابوالحسن محمد ثانی فخر عالم محب اللہ" اب اگر یہ سمجھا جائے کہ سید جلال الدین جعفر گنج علم ابوالقاسم جعفر اور سید جعفر تینوں ایک ہی شخص کے نام ہیں جو مختلف تین طریقوں سے غبط کئے گئے ہیں تب یوں سمجھنا چاہیے کہ اس جعفر کے تین فرزند تھے (۱) سید شاہ ناصر خسرو شہید (۲۰۹ھ - ۱۰۱۸ھ)

جو سید علی ہمدانی اور پیر بابا کے جد امجد ہیں (۲) سید ابو الحسن ہمدانی اور عالم ربیع اور  
 جو سادات کرممان وغیرہ کے جد امجد ہیں، اور جن کا تفصیلی تذکرہ ہم نے اپنی تالیف تاریخ  
 محرم میں درج کر دیا ہے (۳) تیسرے فرزند کا نام والد کی کنیت کی رو سے قاسم ہوگا، ان  
 کا تذکرہ ہمیں مذکورہ بالا شجروں میں نہیں ملتا البتہ سید محمود پیر بابا کی ساکن گزرت (علاقہ  
 گدون) ۱۲۷۶ھ نے اپنی تالیف تذکرہ السادات (قلمی نسخہ) میں ایک سید جلال گنج  
 العلم بغدادی کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سید جلال گنج علم کے جس فرزند کا نام  
 قاسم تھا اس کا لقبی نام عطار اللہ تھا، سید محمود گدونی کے فارسی بیان کا ترجمہ یہ ہے  
 "سید جلال گنج العلم بغدادی جو محمد حسین بغدادی کے فرزند تھے، مشہد میں قیام پذیر  
 تھے، بیس سال بعد وہاں سے بھگڑ آئے اور پھر بھگڑ سے کفار و مشرکین کے خلاف جہاد  
 کی غرض سے ملک کاشکار اور دیر تشریف لے گئے، وہاں جہاد کی لڑائیاں لڑتے رہے  
 اور وہیں سرزمین دیر میں سکونت اختیار کی، آپ کا نام سید جلال گنج علم ہے اور آپ  
 کا سلسلہ نسب سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن سید ابو عبداللہ علی اکبر ابن سید امام  
 حسن عسکری کے ذریعے حضرت امام حسین تک پہنچتا ہے۔"

اس سے پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ سید علی ترمذی پیر بابا کے عام شجروں میں جہاں  
 ایک نام شاہ بلاق ذکر کیا گیا ہے وہاں اسرار طریقت میں اسی نام کی جگہ شاہ ہمدان  
 درج ہے جس سے مراد سید امیر کبیر علی ہمدانی ہیں، شاہ بلاق (بلاق) آپ کا جغرافیائی  
 نسبتی نام ہے جس طرح ہمدان کے رہنے والے شاہ ہمدان کہلاتے اور آپ کا اسم گرامی  
 علی تھا، لیکن یہاں ایک تاریخی نسبت کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ  
 اسی عہد میں جس میں سید امیر کبیر علی ہمدانی (شاہ بلاق بن سید محمد شاق) زندگی گزار  
 رہے تھے ایک دوسرے سید علی ہمدانی بھی بقید حیات تھے جن کا سلسلہ نسب شیخ انوار عثمانیہ  
 تھا اور سید علی سیاہ پوش کے نام سے مشہور تھے، ان کے سلسلہ نسب کا تذکرہ





علاقتے ہیں، یہاں سادات کے مختلف خاندان آباد ہے ہیں، ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت امام علی زین العابدین کے تین فرزندوں امام محمد باقرؑ، سید علی الاصغر اور سید حسین الاصغر کی نسلوں کے سادات کا ذکر نامناسب ہے۔

راہ حضرت امام محمد باقرؑ کے فرزند امام جعفر صادقؑ تھے، جن کے فرزندوں میں امام اسمعیل، امام موسیٰ کاظم اور امام عبداللہ الباہر کی نسل یہاں آباد رہی ہے ان میں سے امام علی رضا ابن امام موسیٰ کاظم کی نسل کے سادات یہاں پھیل گئے ہیں اور سید امیر علی راہ بن سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن علی اکبر ابن امام حسن عسکری کو اسی نسبت سے بخاری کہا جاتا ہے اور اسی نسبت سے ان کے فرزند سید جلال گنج علم کو بھی بخاری کہا جاتا ہے۔

(۲) سید علی الاصغر ابن امام علی زین العابدین کی نسل بھی بخارا و بلخ میں موجود ہے اور پھر خصوصیت کے ساتھ ترمذ میں آباد رہی ہے، جس طرح پیر بابا کا نام سید علی ترمذی ہے، اسی طرح سید علی الاصغر کی اولاد سے بھی ایک سید علی ترمذی ہیں۔ جو تاریخی اعتبار سے پیر بابا سے پہلے ہو گئے ہیں جن کا شجرہ یہ ہے، سید احمد توختہ ترمذی ابن سید علی ترمذی ابن حسین ثانی ابن محمد مدنی ابن سید شاہ ناصر مدنی ابن سید موسیٰ ابن سید علی الحوری ابن حسین افطس ابن امام علی الاصغر ابن امام زین العابدین

(۳) امام زین العابدین کے تیسرے فرزند حسین الاصغر کی نسل میں سے روایت اسرار طریقت (سید علی ترمذی) پیر بابا، کا تیسرا خاندان ہے لیکن ان کا تعلق اس ترمذ سے ہے جو ولایت بلخ میں ہے یا موجودہ شمالی افغانستان میں واقع ہے یہ ترمذ موجودہ ولایت مزارو میمنہ کے شمال مشرق میں تین ذیلی ذروں سے عبارت ہے۔

ایک درہ کا نام قندز (کندوز) ہے اس اعتبار سے پیر بابا کو سید علی قندوزی بھی کہا جاتا ہے، آپ کے والد ماجد (سید قنبر علی) اسی داوئی قندز کے موضع خواجہ سلطان میں

سکونت پذیر تھے۔

(۱) جانا چاہیے کہ سید علی ترمذی (پیر بابا) کی پانچویں پشت میں جد امجد سید احمد بنغیم ولایت بخارا کے اس ترمذ میں تشریف لائے تھے اور ان کے والد سید علی شاہ ہمدان (یا سید احمد شاہ بداق) مملکت خراسان کی ولایت ہمدان میں سکونت پذیر تھے اور بعد میں سید محمد نور بخش ترمذی دوبارہ وہاں ہمدان تشریف لے گئے تھے (اور سید امیر کبیر علی ہمدانی کے خلیفہ مجاز و سجادہ نشین سید ابواسحاق ختانی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو کر سلسلہ کبریہ میں ماذون ہوئے۔ اس سلسلہ کو ذہبیہ بھی کہتے تھے) جہاں آپ نے سلسلہ نور بخشیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس اعتبار سے پیر بابا کے آباؤ اجداد نے خراسان میں زیادہ قیام فرمایا تھا۔ اسی نسبت سے آپ کا ایک لقبی نام شہنشاہ خراسان بھی مشہور ہے۔

(۲) حضرت اخوندروزہ کے بیان کردہ شجرہ میں حضرت پیر بابا کی دسویں پشت میں جد امجد کا نام سید محمود ذکر کیا گیا ہے لیکن شاہ محمد غوث صاحب کے شجرہ میں سید حامد کو براہ راست سید محمد کا فرزند لکھ کر ان دونوں ناموں کے درمیان سلسلہ نسب کے پانچ نام چھوڑ دیئے ہیں۔ تذکرہ کی روایت کے مطابق پیر بابا کا نام سید حسام الدین (بن سید ناصر خسرو بن سید جلال گنج علم) سے سترہویں پشت میں آجاتا ہے جو تاریخی اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سید جلال گنج علم کو اخیسویں پشت میں تسلیم کرنے اور ایک سو سال کے لئے علم اصول تاریخ کی رو سے تین آدمیوں کا سلسلہ نسب میں آنے کے حساب سے حضرت جلال گنج علم کا زمانہ ۳۵۸ھ اور پیر بابا کا ۹۹۱ھ ہے جو ۶۳۳ سال پیر بابا سے پہلے گزرے ہیں۔ لہذا انیس پشتوں کا ہونا صحیح ہے اگر اسرار طریقت کی روایت کو صحیح مانیں جس میں سید جلال گنج علم تیرہویں پشت میں آتے ہیں تو اس صورت میں ان کا زمانہ ۵۹۵ھ کے لگ بھگ بن جاتا ہے پھر اس سے ادھر پانچارہ ناموں کی ضرورت ہوگی جو کسی شجرہ میں اتنی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔

لہذا مجبوراً ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جو نام تذکرہ میں ہیں وہ اسرارِ طریقت میں لکھے سے رہ گئے ہیں، لیکن اس صورت میں کہ ہم حضرت پیر بابا کا شجرہ سید جلال گنج علم تک درست وہی تسلیم کریں جو تذکرۃ الابراہیم والماشرار میں ہے اور اس سے اوپر تذکرہ کا صحیح تسلیم کریں یا اسرارِ طریقت کا، ان دونوں میں فرق نہیں دونوں میں حضرت سید جلال گنج علم حضرت امام حسین علیہ السلام سے چودھویں پشت میں آجاتے ہیں۔

تحقیقی شجرہ باب ہم مندرجہ بالا وضاحتوں اور تحقیقی بحث کی روشنی میں اعلیٰ حضرت مولانا وسیدنا مرشدنا شیخ الاسلام والمسلمین شہنشاہ خراسان غوث زمان سید علی خواں ترمذی رپر بابا علیہ الرحمۃ کا شجرہ نسب سید جلال گنج علم بخاری تک تذکرۃ الابراہیم کی روایت کے مطابق اور اس سے اوپر تذکرہ واسرارِ طریقت دونوں کی روایت کے مطابق درج کر رہے ہیں۔

- سید علی ترمذی ابن سید قنبر علی ابن سید احمد نور ابن سید یوسف نور ابن سید محمد نور بخش ترمذی ابن سید احمد بیغم ابن سید احمد علی شاہ بلاق ابن سید احمد شاق
- ابن سید حامد ابن سید ایوب ابو تراب ابن سید محمود ابن سید اسحاق ابن سید عثمان
- ابن سید جعفر ابن سید عمر ابن سید محمد ابن سید حسام الدین ابن سید شاہ ناصر خسرو
- ابن سید جلال گنج علم بخاری رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ابن سید الونید امیر اعلیٰ
- راہ مطابق تذکرہ الابراہیم ابن سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن سید رابو
- عبداللہ علی اکبر ابن حضرت امام حسن عسکری ابن حضرت امام علی نقی ابن حضرت
- امام محمد تقی ابن حضرت امام علی رضا ابن حضرت امام موسیٰ کاظم ابن حضرت امام جعفر
- صادق ابن حضرت امام محمد باقر ابن حضرت امام علی زین العابدین حضرت الشہید امام
- حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

راہ مطابق اسرارِ طریقت سید جلال گنج بخاری ابن سید جلال گنج بخاری

ابو الحسن علی ابن سید عبداللہ ثانی ابن سید علی الصالح ابن سید ابوالقاسم محمد ابن حسن  
ابن حسین ابن جعفر ابن حسین (حجری) ابن سید عبداللہ زاہد ابن سید حسین الاصفہانی  
امام علی زین العابدینؑ ابن سید الشہداء حضرت امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یہ دونوں شجرے ہمارے سامنے ہیں۔ اب ان میں کس کو صحیح قرار دیا جائے اس کا  
دار و مدار مزید ایسی دستاویزی شہادتوں کے ملنے پر ہے۔ جس کی وجہ سے کسی ایک کو  
مزید تقویت حاصل ہو سکے۔ **وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَةِ الْاَحْاَلِ**

نوٹ: قاضی عبدالعلیم اثر افغانی کا تبصرہ جو ہمیں دستیاب ہوا ہے وہ یہاں ختم ہو  
جاتا ہے۔

”عبرۃ لادلی الالبصار“ مؤلف سید عبدالجبار شاہ ترمذی ستھانوی (علمی نسخہ) کی روایت

اخوند ریزہ بابائے تذکرہ میں جو شجرہ دیا ہے اس میں سب سے بڑا اشکال سید  
محمود مکی کو سید امام محمد مہدی (ابن امام حسن عسکری) کا فرزند بتلانا ہے۔ یہ ایک فاش غلطی  
تھی جس کی تصحیح و تحقیق کے لئے سید عبدالجبار شاہ صاحب نے بڑی چھان بین کی۔ اپنے  
خاندان کے بزرگوں کے علاوہ افغانستان میں بھی جا کر معلومات فراہم کر کے اس غلطی اور  
دوسرے ناموں کی تصحیح میں بڑی جدوجہد کی جس کی تفصیل کتاب مذکور میں موجود ہے انہوں  
نے سید براق کے نام کی بھی درستی کر کے اسے سید احمد براق لکھا ہے جبکہ قاضی عبدالعلیم  
اثر افغانی صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ نام علی شاہ براق یا شاہ ہمدان ہونا چاہیے سید  
عبدالرحیم ابن سید محمود مکی تک تمام ناموں کی تصدیق کر لی۔ اور پہلے انہیں محض نبیر امام  
علی نقی دکھلایا بعد میں مزید معلومات پر انہیں ابن جعفر خلیل اللہ ابن امام علی نقی درج  
کر دیا۔ غالباً جن شجروں و کتابوں کے حوالہ جات قاضی عبدالعلیم اثر صاحب نے دیے ہیں۔  
وہ سید عبدالجبار شاہ صاحب کی نظر سے نہیں گزرے کیونکہ ان کا حوالہ ان کی کتاب  
میں نہیں ملتا لہذا وہ بھی حضرت امام حسن عسکریؑ کی نسل باقی رہنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔

واقعات ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ سادات بنو فاطمہ کو خلفائے بنو امیہ و بنو عباس سے ان کی زیادتیوں کے پیش نظر ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا۔ لہذا غالباً حضرت امام حسن عسکریؑ نے اپنے بیٹوں کو دور محالک میں تحصیل علم اور بعد میں تبلیغ دین کے لئے بھیج دیا تاکہ مخالفین کی زد سے بچے رہیں۔ اس وجہ سے اکثر لوگوں کو ان کا علم نہ تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت امام حسن عسکریؑ نے وفات پائی تو ان کی امامت و وراثت کا دعویٰ سید جعفر ابن امام علی نقی و برادر امام حسن عسکریؑ نے کیا حالانکہ ان کی اولاد موجود تھی اس بنا پر اہل تشیع نے انہیں کذاب کہا ہے (جبکہ ان کی اولاد انہیں تو اب، ثانی دخیل اللہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں) **وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ**۔

قاضی سلیمان سلمان منصور پوری نے اپنی تالیف **رحمۃ للعالمین** کی روایت کے مطابق اور دیگر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ سید جعفر ثانی (تو اب) ابن امام علی نقی تھے جنہیں ابو کریم کہتے تھے کیونکہ وہ ایک سو بیس بچوں کے والد تھے ان کی وفات ۳۲۰ھ میں ہوئی ان کی نسل صرف چھ فرزندوں سے جاری ہے۔

۱۔ اسمعیل حریف ۲۔ یحییٰ الصوفی ۳۔ ہارون ۴۔ علی المسحار ۵۔ رادیس ۶۔ طاہر، اس سے ظاہر ہے کہ سید جعفر ثانی (تو اب) کا کوئی فرزند محمود مکی نہیں جس کی نسل باقی ہو۔ لہذا جب تک کسی مستند روایت سے یہ بات ثابت نہ ہو جو مذکورہ بالا روایات سے قوی ہو۔ تب تک اسے درست نہیں سمجھا جاسکتا۔

اس کے علاوہ اس نسل کے بعض افراد کے پاس ایسا شجرہ بھی ہے جس میں سید جلال گنج علم بخاری شہید راہ بن سید امیر علی (متوفی سنہ ۵۹۵ھ) کو اشتباہ نام سے سید جلال الدین حیدر سرخ بخاری (بن علی اوچی متوفی ۵۹۵ھ) سمجھ کر اس سے اوپر شجرہ سید جعفر ثانی (تو اب) ابن امام علی نقی سے ملا دیا ہے جو بخاری سادات کے جد امجد ہیں نہ کہ ترمذی سادات کے۔ لہذا یہ شجرہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔

نیز ایک شجرہ بھی قابل توجہ ہے جو ادارہ تبلیغ الانساب مطبوعہ لاہور اور حضرت پیر بابا کے مزار شریف پر نصب شدہ سنگ مرمر کی تختی پر کندہ ہے اس میں سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن سید محمد ابن امام علی نقی درج ہے۔ اس شجرہ کی رو سے اخوندرویزہ بابا کے شجرہ میں جو غلطی پائی جاتی تھی یعنی سید محمود مکی کا امام محمد مہدی کا فرزند ہونا (جو چار سال کی عمر میں غائب ہو گئے تھے) اس کا ازالہ ہو جاتا ہے مگر یہاں کسی مستند کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا اگرچہ بعض مورخین نے حضرت امام علی نقی کے صرف تین فرزندوں (جعفر حسن عسکری، حسین) کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ نسل صرف دو سے جاری ہے (رحمۃ للعالمین وغیرہ) یعنی جعفر و حسن مگر "سعادۃ الکونین فی فضائل الحسنین" مؤلفہ شیخ اکرام الدین نبیرہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور "ائمہ اہل بیت" مؤلفہ جمیل احمد صاحب مطبوعہ لاہور میں حضرت امام علی نقی کے چوتھے فرزند محمد حسن کی کنیت ابو جعفر تھی کا ذکر بھی کیا ہے۔ کنیت سے ظاہر ہے کہ آپ صاحب اولاد ہوئے ہیں اور غالباً نسل بھی جاری ہے پیر بابا صاحب کی اولاد سے ایک اور شجرہ بھی ملا ہے جو مذکورہ بالا شجرہ کی تائید کرتا ہے اس میں اعلیٰ حضرت پیر بابا کا شجرہ سید محمود مکی تک اخوندرویزہ بابا کی روایت کے مطابق ہے اور پیر سید محمود مکی کو ابو جعفر محمد کا فرزند دکھایا ہے اس میں لکھا ہے کہ حضرت امام علی نقی کے چار فرزند تھے (چوتھے حسین لا ولد تھے) سید محمد (ابو جعفر) کو فرزند اکبر دکھایا ہے جو حضرت امام علی نقی کی زندگی میں (یا جلد ہی ان کی وفات کے بعد فوت ہو گئے تھے) ان (سید محمد) کے نو بیٹے تھے (۱۔ جعفر ۲۔ محمود مکی ۳۔ رحمت ۴۔ اسحاق ۵۔ غیاث الدین ۶۔ لطف اللہ ۷۔ ہدایت اللہ ۸۔ ابوطالب ۹۔ سکندر) سید محمد کے فرزند سید عبدالرحیم تھے۔ اگر مستند روایت مل جائے تو اس شجرہ سے تمام اشکالات رفع ہو جاتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ابو جعفر محمد ابن امام علی نقی کے نام سے ایک طرف محمد کے نام سے اشتباہ پیدا ہو کر تذکرہ میں ابو جعفر محمد کی جگہ محمد مہدی

اور دوسرے شجروں میں جعفر کے اشتباہ سے جعفر ثانی، تو اب لکھ دیا گیا ہو۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

ما حاصل۔ ساری تحقیق کالب لباب یہ ہے کہ یا تو عبد الحلیم اثر افغانی صاحب کے قول کے مطابق دو جگہ ناموں میں درستی کر کے اخوندرویزہ بابا کے شجرہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے یعنی: سید علی غوامی ترمذی بن سید قنبر علی بن سید احمد نوز بن سید یوسف نوز بن سید محمد نوز بخش ترمذی بن سید احمد بنغیم بن سید احمد (علی) شاہ براق بن سید احمد مشتاق بن سید شاہ ایوب ابو تراب بن سید حامد بن سید محمود بن سید اسحاق بن سید عثمان بن سید جعفر بن سید عمر بن سید محمد بن سید حسام الدین بن سید شاہ ناصر خسرو بن سید جلال گنج علم بخاری بن سید ابو المودید امیر علی بن سید عبدالرحیم بن سید محمود مکی بن سید ابو عبداللہ علی اکبر بن حضرت امام حسن عسکری بن حضرت امام علی نقی بن حضرت امام محمد تقی بن حضرت امام علی رضا بن حضرت امام موسیٰ کاظم بن حضرت امام جعفر صادق بن حضرت امام محمد باقر بن حضرت امام علی زین العابدین بن سید الشہدار حضرت امام حسین۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم) بن

(امام الاولیاء حضرت علی کرم اللہ وجہہ و سیدۃ النساء حضرت فاطمہ بنت

سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

یا مؤخر الذکر شجرہ کے مطابق سید محمود مکی بن سید ابو جعفر محمد بن حضرت

امام علی نقی کے ذریعے سید الشہدار حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچا جائے

اس میں ایک پشت کم ہو جائے گی ان دونوں شجروں میں معمولی اختلاف پایا جاتا ہے

ان دو روایتوں میں جو قومی وثقہ ثابت ہو جائے وہی اختیار کرنے جائے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَةِ الْحَالِ

## نوٹ

اخوندرویزہ باباً ایک جید عالم فاضل تھے۔ متعدد دینی کتب کے مصنف و مؤلف بھی تھے۔ علاوہ ازیں ماہر علم الانساب بھی تھے ران کی تصنیف تذکرۃ الانساب کا حوالہ حیات و آثار حضرت اخوندرویزہ اور ان کا فلسفہ تصوف غیر مطبوعہ مؤلفہ ڈاکٹر حافظ عبدالغفور صاحب میں موجود ہے تقریباً انیس سال انہوں نے اعلیٰ حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے ساتھ گزارے اور آپ کے حالات کی معلومات کا ذخیرہ بھی انہی کی تالیفات و تصنیفات سے ماخوذ ہے۔ لہذا شجرہ نسب کے متعلق ان کی روایت کو زیادہ وقعت حاصل ہے مگر غالباً نقل اور کتابت کرنے والوں سے سہواً دو تین جگہ ناموں میں رد و بدل ہوا جس کی وجہ سے شجرہ میں اشکال پیدا ہو گیا۔ وہ خود اس تساہل سے مبرا ہوں گے تادمی عبدالمحلیم شرافغانی صاحب نے اس کی تصحیح کے لئے خاصی محنت کی ہے۔

حَسَنَ اِنَّ اللّٰهَ اَحْسَنَ الْجَزَا

تَمَّتْ بِعَوْنِ الْمَلِكِ الْحَقِّ الْمُبِينِ ۝  
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الْأَمِينِ ۝  
وَعَلَى آلِهِ وَأَهْلِيهِ أَجْمَعِينَ ۝  
وَالْحَمْدُ وَالشُّكْرُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝



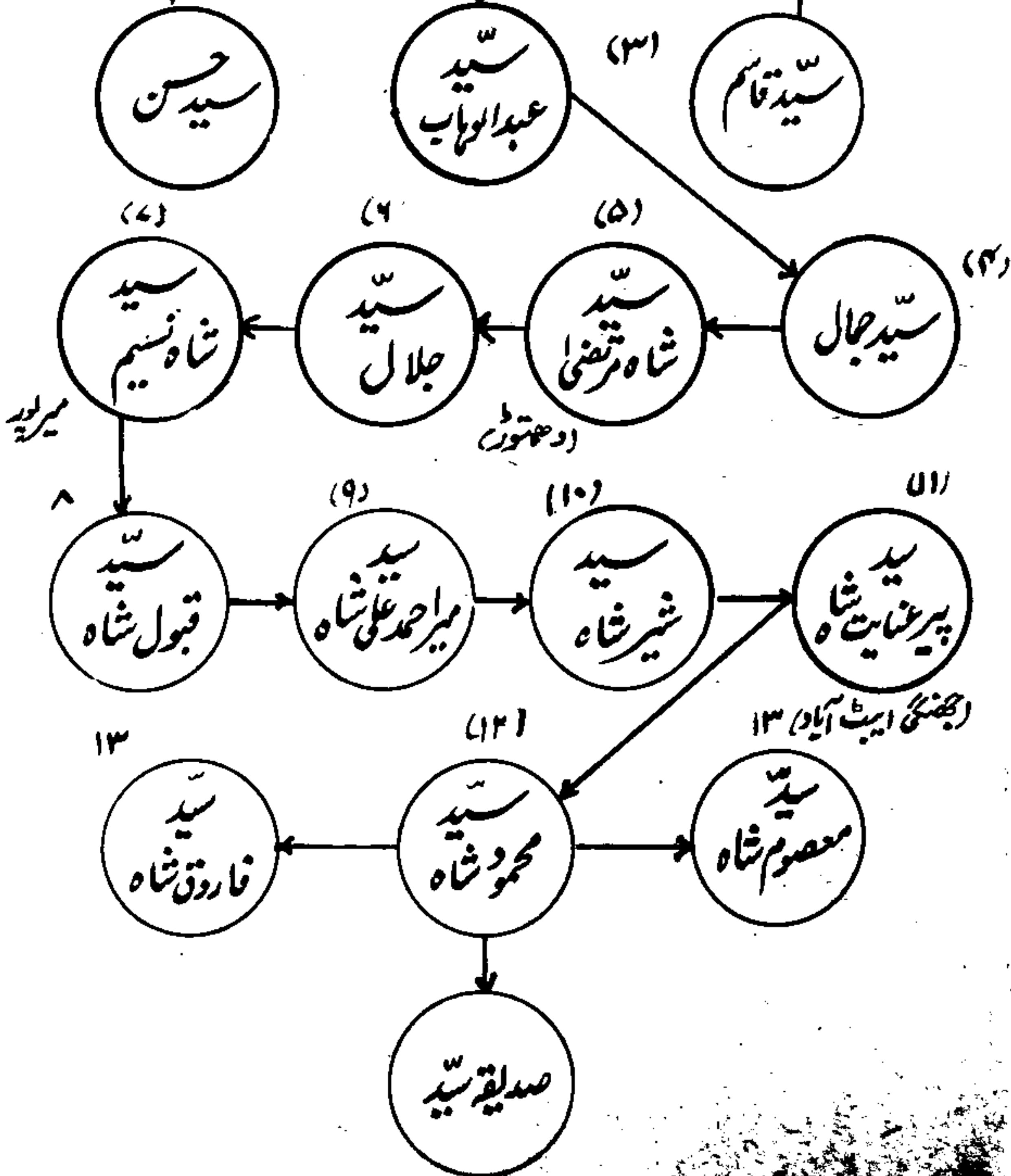
# کتابیات

نام مصنف / مؤلف	نام کتاب	نمبر شمار
اخون درویزہ بابا	تذکرۃ الابرار والاشرار	- ۱
سید عبدالجبار شاہ سہقانوی	عبرۃ للابصار (قلمی)	- ۲
قاضی عبدالخلیم اثر افغانی	مقدم حیات پیر بابا { قلمی و بحث شجرہ نسب	- ۳
مفتی اکرام الدین بنیرہ شیخ عبدالحق محد دہلوی	سعادت الکوین فی فضائل الحسنین	- ۴
شہزادہ داراشکوہ	سفینتہ اولیاء	- ۵
محمد جمیل احمد ایم اے	آئمہ اہل بیت	- ۶
ڈاکٹر محمد ریاض	حضرت میر کبیر سید علی ہمدانی	- ۷
راجہ محمد ارشد	تاریخ ہزارہ	- ۸
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	قول الجبیل	- ۹
سید معین باچا	تذکرہ رسوخ سلطان الاولیاء	- ۱۰
سید امیر شاہ قادری گیلانی	تذکرہ علماء و مشائخ سید	- ۱۱
پنجاب یونیورسٹی	دائرۃ المعارف اسلامی	- ۱۲
ادارہ تبلیغ الانساب لاہور	شجرہ سادات حسینی عہ	- ۱۳
میجر ویس	تاریخ ہزارہ	- ۱۴
اعجاز الحق قدوسی	تذکرہ صوفیاء	- ۱۵
پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ طاہرہ	جہان و آثار اخون درویزہ { اور ان کا فلسفہ تفسیر	- ۱۶

# شجرہ نسب سید محمود شاہ ترمذی

غوث زمان سید علی خواص ترمذی  
المعروف پیر بابا (دبونیہ سوات)

سید مصطفیٰ (کونڑ - افغانستان) (۲)



اس صفحہ پر اعلیٰ حضرت پیر بابا سے منبہ تعلق رکھنے والے حضرات  
اپنا شجرہ نسب درج کر سکتے ہیں۔

سید علی ترمذی (پیر بابا)

سید مصطفیٰ

سید حسن

سید قائم

سید عبدالوہاب

